سہ ماہی

ادبی کارواں

ادبی وثقافتی مجلّہ

Scanned by CamScanner

زیرِ سرپرستی کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی، بھیونڈی

شعبۂ اردو (جی. ایم. مومن ویمنز کالج) کا ادبی و ثقافتی مجلہ

سہ ماہی

ادبی کارواں

مدیران

امیر حمزہ ثاقب
09890250473

عامر صدیقی

09029500621

ادبی کارواں

شعبۂ اردو، جی. ایم. مومن ویمنز کالج، رئیس ہائی اسکول کیمپس،

تھانہ روڈ، بھیونڈی، ضلع تھانہ-421302

Scanned by CamScanner

سہ ماہی

ادبی کارواں

جلد نمبر	:	ایک
شمارہ نمبر	:	۳ (جولائی تا ستمبر ۲۰۱۱ء)
سرورق	:	عمران نوری
کمپیوٹر کمپوزنگ	:	عدنان بیگ
تزئین کار	:	شمیم اقبال
اس شمارے کی قیمت	:	۲۵/روپے
خط و کتابت کا پتا	:	شعبۂ اردو، جی۔ایم مومن ویمنز کالج، رئیس ہائی اسکول کیمپس، تھانہ روڈ، بھیونڈی، ضلع تھانہ-421302
ای-میل	:	ahsaqib29@gmail.com

ملنے کے پتے

☆ شعبۂ اردو، جی۔ایم مومن ویمنز کالج، رئیس ہائی اسکول کیمپس، تھانہ روڈ، بھیونڈی، ضلع تھانہ-421302

☆ مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنسیس بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ، ممبئی۔

☆ کتاب دار، 108/110 جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، نزد جے۔جے۔ ہاسپٹل جنکشن، ممبئی۔

☆ اُردو کتاب گھر، کھوٹالہ تالاب مسجد، منگل بازار سلیب، بھیونڈی۔

Scanned by CamScanner

ترتیب

اداریہ

4 کیا حال بیاں کریے عجب طرح پڑی ہے
• اسیر حمزہ ثاقب

مضامین

6 فیض کی غالب شناسی
• علی احمد فاطمی

20 اقبال کے ریاضِ سخن کی فضائے جاں پرور
• ڈاکٹر سید صفدر

25 جسے میر کہتے ہیں صاحبو!......قاری کی میزان پر
• معید رشیدی

37 بھیونڈی کے شعری افق پر تابندہ مہر و ماہ
• رونق افروز

افسانے

41 فضلو بابا ٹُھ ٹُھ
• ذکیہ مشہدی

48 اعراف
• انیس اشفاق

63 وہ دونوں کون تھے؟
• اشتیاق سعید

غزلیں

67 • سید امین اشرف
68 • غلام مرتضیٰ راہی
69 • شمیم عباس
70 • رؤف خیر
71 • عبدالرحیم نشتر
72 • شکیل گوالیاری
73 • نعمان شوق
74 • خواجہ جاوید اختر
75 • خالد عبادی
76 • کلیم ضیا
77 • نذیر فتح پوری
78 • مناظر عاشق ہرگانوی
79 • نذیر فاضلی

فنونِ لطیفہ

81 مقبول فدا حسین کے فن اور اُن کی انا کو سلام
• نذیر صدیقی

84 ہندوستان کے پکاسو......مقبول فدا حسین
• ہرنھا چٹرجی

88 ایم. ایف. حسین کی موت......
• مادھوری دکشت

جہانِ کتب

90 حرف حرف معتبر
• محمد رفیع انصاری

مکتوبات

شمس الرحمٰن فاروقی، علی احمد فاطمی، عبدالصمد، شکیل گوالیاری، رؤف خیر، احتشام اختر، خالد عبادی، مجیر احمد آزاد

Scanned by CamScanner

اداریہ

کیا حال بیاں کریے عجب طرح پڑی ہے

تشبیہ، استعارہ، تمثیل، تجرید اور علامت کی تعریفات اور ان کے مابین امتیازات قایم کرنے کی ذمےداری علم بیان و بدیع کے ماہرین کے سر، ہو خواہ جدید ناقدین کے سر کہ یہ ایک بہت پیچیدہ عمل ہے لیکن یہ بات تو بالکل صاف اور واضح ہے کہ "حقیقت نگاری اور حقیقت پسندی" کے سحر میں گرفتار ہمارے فکشن کے وہ عشاق جنھوں نے اپنا قبلہ مغرب اور مغربی جمالیات کو بنا رکھا ہے، انھیں اردو افسانے میں کیے جانے والے ہیئتی اور اسلوبیاتی تجربات اس حد تک ناگوار گزرتے ہیں کہ وہ اسے 'پھوہڑ پن، خراب فن کاری بلکہ کھلی انارکی' سے تعبیر کرتے ہیں اور یہاں تک محسوس کرتے ہیں کہ 'اردو ادب کی نجات اسی میں ہے کہ نئے افسانے کی گردن بے دریغ ماردی جائے۔' دل چسپ بلکہ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ یہی لوگ مغرب میں فکشن کی نئی 'شعریات' کی داغ بیل پڑنے پر اچھل اچھل کر تالیاں بجاتے ہیں اور اس لمحے فارم، تکنیک اور تخلیقی ڈسپلن کو یکسر فراموش کر جاتے ہیں کہ جن کے وہ بیمار ہیں۔

فکشن میں فارم اور ہیئت کا مسئلہ اتنا سیدھا سادا نہیں ہوتا جتنا بادی النظر میں دکھائی دیتا ہے۔ داخلی اور خارجی ہیئتی تنظیم کی طویل اور فلسفیانہ بحث سے قطع نظر بعض اوقات بلکہ بیشتر اوقات فارم، مواد کو اور مواد، فارم کو متاثر کرتا ہے۔ فکشن کے عناصرِ ترکیبی پر حد سے زیادہ اصرار کرنا اسے بے انتہا جامد اور مجہول بنا دیتا ہے۔ ایسی صورت میں انتظار حسین کی اس جھنجھلاہٹ پر کہ "صاحب میں افسانے لکھتا ہوں جوتے نہیں بناتا، اچھے جوتوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ پیروں کے ناپ کے مطابق ہو۔"، ایمان لائے بغیر نجات ہی نہیں ملتی۔ کوئی افسانہ یا ناول اس وجہ سے خراب نہیں ہوتا کہ اس میں اسطور، حکایت، استعارے، علامت، تمثیل یا تجرید سے کام لیا گیا ہے اور نہ ہی کوئی ناول یا افسانہ اس وجہ سے کامیاب ہوتا ہے کہ اس میں ان تمام فنی لوازمات کی پابندی ملتی ہے جسے وقار عظیم اور وارث علوی صاحبان نے بیان کیے ہیں۔ اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ

Scanned by CamScanner

افسانہ اور ناول، دراصل کہانی بیان کرنے کا فن ہیں تو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ بیان کے پیرایے مختلف ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ اس بات پر کلی طور پر نہ سہی، جزوی ہی سہی ایمان رکھتے ہیں کہ افسانے اور ناول میں زندگی کی بہترین عکاسی ملتی ہے تو اس امکان کو بھی خارج نہیں کر سکتے کہ زندگی کی پیچیدگی، تہہ داری اور پر اسراریت کو بیان کرنے کے لیے اسلوب و بیان کے پیرایے بھی پیچیدہ، تہہ دار اور پر اسرار ممکن ہیں اور اگر آپ زندگی کو معروضی سطح پر دیکھنا اور دکھانا چاہتے ہیں تو پیچیدگی سے مفر ممکن ہی نہیں ہے۔ اس سے بد کنے کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوگا کہ آپ اپنی سہل پسندی اور تن آسانی کا جواز 'جدید افسانے سے انکار' میں تلاش کر رہے ہیں جسے کسی بھی زاویے سے مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بنیادی بات فنکار کی ذہنی تربیت، شخصیت کی بوقلمونی اور اس کی تخلیقی صلاحیت ہے کہ وہ اظہار و بیان کے کن وسایل کو بروئے کار لاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ روایتی سانچوں کی پابندی کرتے ہوئے بھی کوئی فنکار اس میں کوئی ایسی جہت پیدا کر دے جو اسے 'فارمولا ٹائپ' ہونے سے بچا لے جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ فارم کو منہدم کرنے کی صورت میں فنکار صرف ملبہ پیدا کرے۔

جدید افسانے پر الزامات کی فہرست یوں تو کافی طویل ہے لیکن ایک بات جو تواتر اور تسلسل کے ساتھ کہی گئی ان میں سے ایک یہ ہے کہ ان افسانوں نے بیانیہ اور کہانی کا خون کر دیا اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ کہانی اور بیانیہ کی واپسی ہوئی ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ جو حضرات یہ اعلان کر رہے ہیں ان کے نزدیک کہانی اور بیانیہ کا اصل مفہوم کیا ہے؟ اور یہ کہ جدید افسانوں سے کہانی اور بیانیہ کا اخراج کیسے اور کس طرح ہوا؟ کہانی اور بیانیے کی جزئیات اور تفصیل میں پڑے بغیر صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جدید افسانے کی تفہیم و تحسین از سرِ نو ہونی چاہیے انھیں یہ کہہ کر کہ "تجریدی آرٹ کے اس نادر نمونے...... یعنی جدید افسانے کے اونٹ کی سواری حوصلہ شکن، صبر طلب اور تھکا دینے والی ہے، یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ اونٹ کون سی کروٹ بیٹھے گا۔ ادب کی شطرنج پر تو وہ دو ورق چلتا ہے اور اپنی اس چال میں مست ہے۔ اس پر تنقید ناممکن ہے کہ دوسرے افسانوں میں تو دوسرے حیوانوں کی مانند ایک دو انگ بانکے ٹیڑھے ہوتے ہیں۔ یہاں تو اٹھارہ کے اٹھارہ ٹیڑھے ہیں۔" (وارث علوی، جدید افسانہ اور اس کے مسایل) بہ یک جنبشِ قلم رد کر دینے کا عمل ایک انتہا پسندانہ عمل ہے۔ دراصل جدید افسانے کی قرأت صبر و ذہانت کی متقاضی اور 'تخلیقی ذہن' کی طالب ہوتی ہے۔

ویسے یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ جدید افسانے کی تفہیم و تحسین کی عملی کوششیں سرے سے ہوئی ہی نہیں، بے شک ہوئی ہیں لیکن یہ بھی ہوا کہ یہ ساری کوششیں یا تو نظریاتی و گروہی تعصب کا شکار ہو گئیں یا پھر اردو کے ادبی معاشرے نے انھیں اتنی سنجیدگی سے نہیں لیا کہ جس کی وہ متقاضی تھیں۔

کیا اسے اردو افسانے کی بدنصیبی نہیں کہا جا سکتا؟

امیر حمزہ ثاقب

Scanned by CamScanner

علی احمد فاطمی

فیض کی غالب شناسی

یوں تو عام طور پر لوگ واقف ہیں کہ ہم وطن، ہم زمین اور کسی حد تک ہم عصر ہونے کی وجہ سے فیض اقبال سے قربت اور عقیدت رکھتے تھے (حالاں کہ اقبال فیض سے تقریباً ۳۴ رسال بڑے تھے) زندگی میں کئی بار ملے بھی۔ شاباشی حاصل کی اور اقبال کے ہی سفارشی خط کے ذریعہ لاہور کے کالج میں ان کو داخلا ملا۔ اسی کالج کے ایک جلسے میں پہلے اقبال کی زندگی میں اقبال پر نظم کہی (۱۹۳۱ء) اس کے بعد اقبال کے انتقال پر بھی موثر نظم کہی (۱۹۳۸ء) جو اقبال کے تئیں گہرا اور سچا خراج تھی...... لیکن یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ ایک خاص موڑ تک وہ اقبال سے عقیدت رکھتے ہیں، آگے چل کر یہ راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ فیض فکری و شعری حوالوں سے اقبال سے زیادہ غالب کے قریب نظر آتے ہیں حالاں کہ وہ غالب سے کبھی ملے نہیں نہ ہی ان کو دیکھا (دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کہ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہو چکا تھا) صرف دیوانِ غالب اور کلامِ غالب کے مخصوص و منفرد شاعرانہ تخیل و تفکر، اسلوب و آہنگ انھیں غالب کے قریب لے آیا۔

فیض نے ایک نہیں متعدد مضامین تحریر و تقریر میں غالب سے اپنی گہری عقیدت اور واقفیت کا اظہار کیا ہے۔ عقیدت کا اظہار تو وہ اقبال کے لیے بھی کرتے ہیں مضامین بھی لکھے ہیں لیکن غالب سے عقیدت قدرے مختلف تھی۔ اقبال کے تئیں ان کی عقیدت روحانی ہے لیکن غالب سے انسانی اور وجدانی ہے، اسی لیے وہ اقبال سے زیادہ غالب کو پڑھتے ہیں۔ عبادت بریلوی نے فیض سے ایک انٹرویو لیتے ہوئے ایک سوال کیا تھا...... ''اردو شاعروں میں آپ نے کون کون سے شاعروں کا مطالعہ کیا ہے؟ اور کون کون سے آپ کو پسند ہیں؟'' تو فیض کا جواب تھا...... ''اصل میں مطالعہ جسے کہتے ہیں وہ تو میں نے ایک ہی شاعر کا کیا ہے یعنی غالب کا......'' اس کے بعد میر، نظیر، انیس کا نام لیتے ہیں اور ہم عصروں میں راشد

Head of the Urdu Department, Allah Abad University, Allah Abad (U. P.)

Scanned by CamScanner

کا...... سچ یہ ہے کہ فیض کے ذہن کی شعاعیں پھوٹنے لگتی ہیں اور شاعری کو ہلکے پھلکے رومان اور عشقیہ جذبات سے نکال کر حیات و کائنات کے فلسفوں سے جوڑنے لگتے ہیں تو اس سنجیدہ فکری عمل میں جو شاعر سب سے زیادہ ان کے قریب آتا ہے، ان کی رہ نمائی کرتا ہے وہ غالب اور صرف غالب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے پہلے ہی مجموعے کا نام غالب کے مصرعے سے مستعار لیتے ہیں اور ''نقشِ فریادی'' نام رکھتے ہیں۔

کم سخن اور کم نویس فیض آگے چل کر غالب پر ایک نہیں تین تین مضامین، تبصرے اور ڈرامے لکھتے ہیں۔ جس میں ایک مضمون، غالب کی ایک مکمل غزل کا عملی تجزیہ ہے۔ غالباً فیض کا پہلا اور آخری تجزیہ ہے جو انھوں نے کسی شاعر کی مکمل غزل کو لے کر اس کے ایک ایک شعر، ایک ایک مصرعے کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ تجزیہ پہلے تقریر کی شکل میں پاکستان نیشنل سینٹر، اسلام آباد اور ادارۂ یادگارِ غالب کے مشترکہ اہتمام میں جولائی ۷۳ء میں ایک جلسے میں پیش کیا گیا اس کے بعد ہندوستان (آج کل فروری ۷۴ء) میں بھی شایع ہوا۔ اس سے قبل وہ ایک بے حد اہم مضمون ''غالب کے تخیل کے بنیادی عناصر'' لکھ چکے تھے جو ۱۹۴۴ء میں نیا ادب کے تیسرے شمارے میں شایع ہوا۔ فیض نے غالب کی شاعری اور اس کے فلسفے کو بنیاد بنا کر ایک ڈرامہ بھی لکھا جو ان کے تنقیدی مضامین کی کتاب 'میزان' میں شامل ہے اس کے علاوہ بکھری ہوئی نہ جانے کتنی تقریریں اور تحریریں ہیں جن میں فیض نے غالب کو بنیاد بنا کر یا کسی دیگر حوالوں سے غالب کی شاعری پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ فیض کے دوست مرزا ظفر الحسن جو غالب کے بے حد عقیدت مند تھے انھوں نے پاکستان میں غالب لائبریری قایم کی اس کے سالانہ جلسوں میں فیض اکثر جاتے تقریر کرتے، ان تقریروں، انٹرویوز اور دیگر تحریروں کو بہت بعد میں فیض کی اجازت سے مرزا ظفر الحسن نے 'لوح وقلم' کے عنوان سے شایع بھی کر دیا۔ اس میں وہ مکمل مضمون شامل نہیں ہے جو 'نیا ادب' میں شایع ہوا اور وہ غالب سے متعلق فیض کا بے حد اہم مضمون ہے اس کتاب میں فیض سے مختار زمن کا لیا ہوا ایک انٹرویو بھی شامل ہے۔ جس کا عنوان ہی غالب ہے اس انٹرویو میں زمن نے براہِ راست غالب کے موضوع پر فیض سے گفتگو کی ہے یہ گفتگو اصلاً انگریزی میں ہے لیکن زمن نے ہی اس کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ اسی کتاب میں 'نقش فریادی' کے حوالے سے بھی غالب پر گفتگو کی گئی ہے۔ جن کا ذکر آگے آئے گا غرض کہ فیض کی شاعری فکر و خیال، تنقید و تحقیق ہر جگہ غالب نظر آتے ہیں۔ مجھے انھیں تحریروں اور تقریروں کی روشنی میں فیض کی غالب شناسی پر مختصراً اظہارِ خیال کرنا ہے جو آسان کام نہیں، بہر حال اپنی بساط بھر فیض کی غالب شناسی کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

میں اپنی گفتگو کی ابتدا فیض کے اس مکمل مضمون سے کرتا ہوں جو 'نیا ادب' میں شایع ہوا۔ غالباً غالب پر یہ ان کی پہلی تحریر ہے۔ جس کا عنوان ہے 'غالب کے تخیل کے بنیادی عناصر' جس کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے:

'' غالب کے کلام میں زبان اور مضامین کے مختلف مدارج کے باوجود ہم ایک واضح اور نمایاں وحدت یعنی Unity محسوس کرتے ہیں اس وحدت کی علت اور نوعیت کیا ہے۔ وہ کون سا شیرازہ

Scanned by CamScanner

ہے جو غالب کے خیالات پریشاں کی جز بندی کرتا ہے۔ عام طور سے وحدت دو تین چیزوں سے پیدا ہوتی ہے یا کسی مربوط نظریے یا عقیدے کی وجہ سے جیسا کہ اقبال کے کلام میں ہے۔''

محض ۳۲ رسال کی عمر میں لکھا جانے والا یہ مضمون ابتدا ہی سے فکرِ غالب کے ساتھ ساتھ فکرِ فیض کا ایک وسیع در وا کرتا ہے اور یہ بھی مشکل ہے کہ غالب کے یہاں ہر دور میں ہر رنگ، مزاج کے اشعار ملتے ہیں۔ اسی لیے وحدت کی تلاش مشکل تو ہے۔ پھر وہ جذبے کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کا یہ خیال سامنے آتا ہے کہ جذبے کو بھی کسی ایک خیال یا معنی میں باندھا نہیں جا سکتا اس کے الگ الگ وقت میں الگ الگ انداز کے معنی رہے ہیں۔ ان کا یہ جملہ جرأت مندانہ ہے: ''ہمارے ہاں جذبہ ایک بہت ہی مبہم اور غیر معین اصطلاح ہے جس سے کئی مختلف اور الگ تھلگ تجربات مراد لیے جا سکتے ہیں۔'' اس کے بعد وہ جذبے کو Emotion، Feeling اور Mood میں تقسیم کرتے ہیں۔ ان معنوی ابعاد اور تقسیمِ الفاظ کے باوجود وہ اعتماد سے کہتے ہیں: ''غالب کے کلام کی وحدت یا Unity ایک ہی موڈ کی وجہ سے ہے اگر موڈ Mood کا ترجمہ ہم کیفیت کر سکیں تو یوں کہنا چاہیے کہ غالب کے تمام مضامین اور تجربات مختلف اور متنوع ہوتے ہوئے بھی ایک ہی ہم رنگ کیفیت کے حامل ہیں، تو سوال یہ ہے کہ غالب کے کلام کی بنیادی کیفیت کیا ہے؟ اگر اس کے لیے میں کوئی ایک لفظ سوچ سکا ہوں تو وہ اداسی ہے اور غالب کے تخیل کا شیرازہ یہی اداسی کی کیفیت ہے۔'' جیسا کہ عرض کیا گیا کہ فیض کا یہ مضمون ۱۹۴۴ء میں ترقی پسند تحریک کے رسالہ 'نیا ادب' میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت تک فیض ترقی پسند مصنفین کی تنظیم و تحریک سے مکمل اور بھرپور طریقے سے وابستہ ہو چکے تھے۔ ''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ'' یا ''تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے'' جیسے مصرعے خلق کر چکے تھے۔ یہ طور محاورے اور بعد میں نعرے کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اور ہر ترقی پسند شاعر امید و نشاط، اشتراک و اجتماع کی باتیں کر رہا تھا ایسے ماحول میں فیض غالب کی شاعری پر مضمون لکھتے ہوئے اس معروضیت اور رجائی کیفیت کے بہ جائے اداسی پر بحث کرتے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے لیکن اسی مقام پر فیض کی انفرادیت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ جدت کے ساتھ ساتھ روایت کی پاس داری پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اردو شاعری میں اداسی، رنجیدگی، اور غم زدگی کے عناصر بڑے انمول رہے ہیں، ان کو مختلف زاویوں سے پیش کر کے شعرائے متقدمین نے عالمِ بیزاری، اقتدار کی نفی اور زندگی کی بے ثباتی کو بڑے معنی خیز اور فکر انگیز انداز میں پیش کیا ہے۔ خود غالب کے یہاں رنج و غم کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ بے حد پُر اثر اور کیفیت انگیز ہیں فیض نے اداسی کا ذکر تو کیا لیکن فوراً کہہ اٹھتے ہیں:

> ''اداسی سے میرا کیا مطلب ہے یہ ابھی عرض کروں گا لیکن یہ میں ابھی کہہ دوں کہ میرا کیا مطلب نہیں ہے۔ اس سے میرا مطلب قنوطیت یا یاسیت ہرگز نہیں ہے۔''

پھر یہ بلیغ بات بھی کہتے ہیں:

> ''اول تو قنوطیت واردات نہیں عقیدہ ہے۔ جس میں وہی قطعیت، وہی تیقن اور وہی خود اعتمادی پائی

Scanned by CamScanner

جاتی ہے جو رجائیت یا کسی دوسرے عقیدے میں دیکھتے ہیں۔دوسری بات یہ ہے کہ قنوطیت یا یاسیت ایک مفرد اور یک طرفہ چیز ہے لیکن اداسی کوئی عقیدہ نہیں محض ایک کیفیت ہے اور کیفیت بھی کوئی واضح اور متعین نہیں بلکہ بہت دھندلی اور موہوم۔''

آگے چل کر وہ اس کیفیت کو بھی تین عناصر میں تقسیم کرتے ہیں۔ماضی کی یاد، کچھ حال کی بے کیفی، کچھ مستقبل میں ماضی کے ٹوٹنے کی حسرت۔امید بھی ناامیدی بھی......ان عناصر کی روشنی میں وہ غالب کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں اور ان اشعار سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں جن میں محبت، راحت اور لذت ہے لیکن فیض ان اشعار میں ایک زاویہ یہ نکالتے ہیں، کہتے ہیں:

فیض نے غالب کے بعض رجائی وحیات افزا اشعار کو ماضی سے وابستہ کر کے ماضی اور معنی کا ایک نیا زاویہ تلاش کیا ہے کہ جب انسان کا حال اندوہ ناک اور اذیت ناک ہوتا ہے تو وہ فطری اور فکری دونوں اعتبار سے ماضی کی طرف مراجعت کرتا ہے اور اسے ایک طاقت اور تقویت کے طور پر قبول کرتا ہے اسی لیے فیض نے کہا ہے کہ: ''ماضی ہی ایک چیز ہے جو غالب کے ذہن میں موہوم نہیں......'' دراصل ماضی کی اس مضبوطی میں حال کی کمزوری دکھائی دے رہی ہے، اسی لیے آگے بڑھ کر فیض نے غالب کے ان اشعار کا سہارا لیا ہے جو حال کی تباہی و بربادی سے تعلق رکھتے ہیں پس پردہ جن کا تعلق ۱۸۵۷ء کے حادثات سے تھا جس سے غالب بے حد متاثر تھے۔متحیر بھی اور متغیر بھی......ان کیفیات سے متعلق فیض اشعار پیش کرتے ہیں۔دو تین اشعار دیکھیے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا
وہ فراق اور وہ وصال کہاں　　وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

اس میں جو یاد کا استعارہ ہے وہ بھی ماضی کا اشاریہ ہے لیکن جو درد ہے وہ حال کا رزمیہ ہے۔اس رزمیے کو غالب نے کئی پہلوؤں کے ساتھ پیش کیا ہے ویرانی میں دشت کو دیکھ کر گھر یاد آنا، در و دیوار پر سبزہ اور گھر میں بہار کی آمد اور پھر یہ...... ''گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے۔'' لیکن یہ بھی کہتے ہیں...... ''انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا......'' ان غموں کو لے کر فیض کا ایک اور عمدہ اور معنی خیز جملہ نکلتا ہے وہ یہ کہ...... ''غالب غم آشنا ہیں، غم پرست نہیں......'' وہ ان غموں سے یا زخموں سے، کہیں عرفان اور گیان دھیان، کہیں بے نیازی اور کہیں فلسفہ طرازی سے کام لیتا ہے جس سے شاعری میں رنگارنگی تو پیدا ہوتی ہے لیکن مرکز میں یا بطن میں وہی اداسی کی کیفیت ہے جسے فیض نے ابتدا میں وحدت کے طور پر لیا ہے۔تین چار مصرعوں میں یہ رنگارنگی ملاحظہ کیجیے۔

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے　　نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں　　ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

Scanned by CamScanner

آ ہی جاتا، وہ راہ پر غالب ۔۔۔ کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

لیکن اس تخریب میں غالب حسرتِ تعمیر بھی رکھتے ہیں۔

گھر میں کیا تھا جو ترا غم اسے غارت کرتا ۔۔۔ وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ۔۔۔ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

اس تخریب وتعمیر کے درمیان فیض، غالب کی شاعری میں ماورائیت کی بھی ایک جہت دیکھتے ہیں۔اچھی خاصی جمی جمائی بساط الٹ جائے، تہذیبیں اجڑ جائیں، انسان کا خون پانی ہوجائے تو ماورائیت کی کیفیت کا آجانا غیر فطری نہیں لیکن غالب اس ماورائیت میں مجہولیت نہیں پیدا ہونے دیتے بلکہ اسے بھی تفکر کی نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غالب صوفی مزاج کے بھی تھے اس لیے اکثر مقام پر تصوف اور تفکر باہم مدغم ہو گئے ہیں۔فیض نے اس مزاج کے اشعار بھی پیش کیے ہیں اور اس مصرعے پر اپنی گفتگو ختم کرتے ہیں: ''عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے'' لیکن جلد ہی غالب کے اندر کا خوددار اور طرح دار شاعر ان سب واقعات اور حادثات کو ایک کھیل سمجھنے لگتا ہے اور ایسے بے پناہ غیر معمولی اشعار بھی خلق کرنے لگتا ہے۔

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے ۔۔۔ ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک ۔۔۔ اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

فیض نے بڑی خوبی اور ہنر مندی کے ساتھ غالب کے ماضی اور حال کی کشاکش کو بہ ظاہر اداسی کے حوالے سے لیکن بہ باطن غالب کے اصل مزاج وکیفیت کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔فیض کا خیال ہے کہ ماضی اور حال کو الگ الگ کر کے دیکھ پانا مشکل ہے۔حال انتشار میں وہ لامحدود مناظر پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔لکھتے ہیں:

''اس کے نقوش ایک لامحدود پس منظر سے یوں گھلتے چلے جاتے ہیں کہ تصویر اور اس کے پس منظر کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔''

اس وحدت کے انیک روپ ہیں جو غالب کبھی محبوب کے بدن میں تلاش کرتے ہیں تو کبھی نقش فریادی کے کاغذی پیراہن میں کبھی تخریب کی تصویر میں تو کبھی حسرتِ تعمیر میں، اس رنگا رنگی کو اکثر کم نظر اور قلیل فہم نقاد غالب کی موہومیت سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔لیکن فیض کہتے ہیں:

''اس موہومیت کی وجہ سے غالب میں ایک ایسی گہرائی، ایک ایسی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوگئی ہے جو انھیں معاملہ بند شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔''

فیض نے نہایت عرق ریزی اور عمیق نظری کے ساتھ اشعار کے حوالے سے غالب کے غم اور اداسی میں ترقی پسندی اور روشن خیالی کے عناصر تلاش کیے ہیں وہ قابلِ داد تو ہیں ہی نیز فیض کے ناقدانہ ودانش ورانہ ذہن کی غمازی کرتے

Scanned by CamScanner

ہیں اور فیض کی شعری تخلیق و تفہیم کی نزاکتوں اور گہرائیوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ مضمون ختم ہونے سے پہلے یہ تحریریں آتی ہیں جن سے فیض کی ترقی پسندی اور غالب فہمی دونوں ہی اجاگر ہوتے ہیں:

''غالب کے کلام کے غم ونشاط دونوں میر یا داغ کی طرح ذاتی یا نجی نہیں بلکہ اجتماعی اور ہمہ گیر ہیں ۔خلاصہ یہ کہ غالب کا کلام ایک موہوم ہمہ گیر اداسی کا آئینہ ہے۔اس اداسی میں ماضی کا غم ہے، حال سے بےاطمینانی ہے، انقلاب کی آرزو ہے، کچھ کرنے کی حسرت ہے اور نہ کر سکنے کا دکھ ہے۔''

اور مضمون ان جملوں پر ختم ہوتا ہے:

''یہ کیفیت ایک فرد کی ذاتی کیفیت نہیں، ایک نسل، ایک دور کی اجتماعی کیفیت تھی۔ غالب کی نسل تاریخ کے ایک بڑے دوراہے پر کھڑی تھی۔ پرانا نظام ٹوٹ چکا تھا اور نئے کی ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ غالب کے ہم عصروں کو اس تعمیر کی حسرت تھی۔ پرانے شیرازۂ حیات کو دوبارہ مرتب کرنے کی آرزو بھی امید نہیں تھی، ماضی کے حسن کا احساس تھا لیکن حال کے خدوخال کے ادراک یا رنگینی کے تصور کا دماغ نہیں تھا، یہاں تک کہ انھیں ماضی کے کھنڈروں میں بھی ایک حسن دکھائی دیتا تھا۔ کسی خوب صورت عورت کے ڈھلتے ہوئے شباب کا سا حسن، یہی اداس تاثر، یہی اداس کیفیت ایک بوجھ ایک تھکن کی طرح ان کے سارے کاروبارِ دل و دماغ پر حاوی تھے اور بدقسمتی سے ہمارا ماحول اور ہماری اجتماعی واردات اس سے بہت مختلف نہیں ہے۔ غالب ایک ایسے دور کا جذباتی ترجمان ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ ایک ایسی نسل کا نغمہ سنج جو ابھی دفنائی نہیں گئی۔''

دیکھیے کس طرح غالب کی اداسی، غالب کی شاعری کو فیض اپنے احساسات اور اپنے دور کے حالات سے جوڑ کر اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں اور یہ کام صرف فیض ہی کر سکتے ہیں جو صرف شعر نہیں کہتے بلکہ غنائی شاعری میں بھی تاریخ و تہذیب کے کیف و کم اور معاشرے کے پیچ وخم کو جذب کر لیتے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ فیض نے غالب کی ایک غزل کا عملی تجزیہ بھی کیا ہے جسے عملی تنقید کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ غالب کی مشہور و معروف غزل ہے۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے   جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

غالب کی یہ غزل سترہ اشعار پر مشتمل ہے اور بہ قول فیض...... ''غالب کی سب سے طویل اور ان کی فکر و تکنیک کی سب سے نمائندہ غزل ہے۔ طوالت کے باوجود فیض کا خیال ہے کہ غزل میں شروع سے آخر تک ایک ہی بنیادی مضمون اور ایک ہی کیفیت ہے۔ یہ بالکل ایک راگ یا ایک میوزیکل کمپوزیشن یا فلم کی طرح ہے۔''

فیض نے غزل کے مطلعے کو پوری غزل کی تمہید قرار دیا ہے اس پوری کیفیت کی تمہید جو اس غزل میں رچی بسی ہے

Scanned by CamScanner

اور یہ انفرادیت بھی کہ 'یار' کو خلوت میں لانے کے بجائے مہمان بنانے کا قصد کیا ہے۔ فیض مہمان لفظ کی تشریح کس انداز سے کرتے ہیں:

''اس شعر میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ مدت ہوئی ہے یار سے ملے ہوئے اور یار سے خلوت میں ملاقات کے لیے نہیں بلکہ یار کو مہماں کیے ہوئے مدت گزر چکی ہے۔ مہمان کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کے دو پہلو غور طلب ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کسی اجنبی کو یا کسی ایسے شخص کو مہمان نہیں رکھا جاتا جس سے کبھی کبھار کی ملاقات ہوئی ہو، مہمان تو اسی کو رکھا جاتا ہے جس سے کافی میل ہو، جس سے ایک پرانا ربط ہو، جس سے بے تکلفی کا ایک رشتہ ہو۔ چناں چہ غالب محبوب سے تخلیے میں ملاقات یا وصال کا ذکر نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک ایسے شخص کا ذکر کر رہے ہیں جس سے پرانا تعلق خاطر ہے، بے تکلفی ہے۔ جس کا آنا جانا ہے اور جس سے ملاقات نہیں بلکہ مہمانی مقصود ہے۔ مہمان داری کا ایک اپنا لطف ہے جو کہ ملاقات کے لطف پر مستزاد ہے۔ دوسرا پہلو جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ یار یا محبوب کی مہمان داری تخلیے میں نہیں بلکہ جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے ہے۔ بات یہ نہیں کہ کوئی اکیلا ملنے کے لیے آیا ہے بلکہ محفل ہے، بزم ہے اور غالب جس چیز کو یاد کر رہے ہیں وہ وصالِ یار نہیں بلکہ محفلِ یاراں ہے۔''

مہمان نوازی، محفل سازی اور محفلِ یاراں کے حوالے سے فیض نے کیا عمدہ اور باریک پہلو نکالا ہے اور اس پہلو کی بلاغت اس وقت اپنے عروج پر پہنچتی ہے جب اس میں فیض عصریت تلاش کرتے ہیں اور یہ معنی خیز جملے نکالتے ہیں...... ''انھیں محبوب کے بچھڑنے کا نہیں بلکہ محفل کے اجڑنے کا دکھ ہے۔'' محفل صرف غالب کی نہیں بلکہ محفلِ دہلی اور بساطِ زندگی...... اسی لیے غالب اداس ہیں۔ دیکھیے غالب کی اداسی یہاں بھی آ گئی۔ یہ اداسی بہ قول فیض...... ''غالب کی ذاتی کیفیت نہیں تھی بلکہ اس زمانے کے معاشرے کی اجتماعی کیفیت تھی......'' اس اجتماعی کیفیت میں ۱۸۵۷ء کے نشیب و فراز، بحران اور انتشار، اجتماعی تقلیب، تہذیبی تخریب کا دخل ہے جسے غالب کی چشم بینا نے دیکھا، اسی لیے پہلے شعر میں بزمِ چراغاں ہے تو دوسرے شعر میں......

مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو

جگرِ لخت لخت کی اصطلاح، دعوتِ مژگاں کی خواہش، غالب کی غم گینی اور اداسی کے وہ تخلیقی مظاہر ہیں جو فیض کو فکری و شعری سطح پر غیر معمولی طور پر متاثر کرتے ہیں اور آگے چل کر قدرے بدلی ہوئی شکل میں بلکہ یوں کہیے کہ لفظی ترکیب اور اصطلاحی تخلیق میں فیض کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ اس مضمون میں فیض نے غالب کی اس اداسی یا غم گینی کو سیکوینس میں سمجھا اور پیش کیا ہے اور یہ بھی کہا...... ''غزل کے باقی شعر اسی مضمون پر ہیں کہ وہ شوق، وہ حسرت، وہ طلب اور وہ ہوس جو پرانی محفل کے

Scanned by CamScanner

لوازمات میں تھے انھیں اپنے آپ پر دوبارہ طاری کیا جائے......'' اس طرح وہ تیزی سے دیگر اشعار کے معنوی ربط اور فکری وحدت کو بیان کرتے ہوئے غزل کے آخری چند اشعار پر گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں.....'' بعد میں غالب کو خیال آتا ہے کہ یہ سب بے کار کی باتیں ہیں نہ تو محبوب آئے گا نہ گریبان چاک اور نہ شوق کا وہ عالم ہم پر طاری ہوگا کہ جس کے لیے ہم بھٹکتے پھرتے ہیں۔ آخر میں اداسی کے بطن سے پیدا ہونے والی اس کیفیت کو بھی محسوس کرتے چلیے جہاں غالب مایوسی اور شکست خوردگی کے باوجود ہمت نہیں ہارتے اور حقایق کے مخالف تصورات پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن　　　بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

اور پھر مقطعے میں غالب کا یہ شعر ابھرتا ہے ؎

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے　　　بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

اور مضمون اس شعر کی وضاحت کے ساتھ ان جملوں پر ختم ہوتا ہے:

''غالب، یہ سب فضول باتیں ہیں کیوں یہ قصے چھیڑتے ہو، کیوں محبوب کی یاد دلاتے ہو، کیوں محفل کا ذکر کرتے ہو، جانے دو ان تمام باتوں کو، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم تہیۂ طوفاں کر لیں، رونا دھونا کر لیں، دل کا بخار ہلکا کر لیں۔ اب کچھ ہونا ہوانا نہیں ہے۔ اس لیے غالب، بہتر یہی ہے کہ تم سارے ذکر اذکار سے پرہیز کرو تا کہ یہ طوفان تھم جائے، ختم ہو جائے۔''

فیض کا یہ تجزیاتی مضمون ان کے پہلے والے تصورات و خیالات سے بہت مختلف نہیں ہے البتہ انداز و اسلوب مختلف ضرور ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے کہ پہلا مضمون فکری اور تنقیدی نوعیت کا ہے اور دوسرا عملی اور تجزیاتی۔ دوسرے مضمون کی یہ خصوصیت تو ہے ہی کہ اس تجزیاتی عمل میں غزل کے داخلی مزاج اور بالخصوص غالب کی غزل ترکیب و تنظیم کو لفظی اور اصطلاحی معنوں میں کس انداز سے دیکھتے اور سمجھتے ہیں۔ اندرون میں داخل ہو کر باطنی کیفیات کے ایک ایک موڑ میں اتر کر وہ غالب کی ذہنی کیفیت کو بہ خوبی اور کامیابی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ یہ فیض کا اپنا انداز ہے۔ غالب فہمی کا نیا انداز۔ جس کا ایک انوکھا اور نرالا رخ غالب سے متعلق لکھے گئے ڈرامے میں ملتا ہے۔ راقم الحروف نے اس ڈرامے پر الگ سے مضمون قلم بند کیا ہے جو شایع بھی ہو چکا ہے۔ یہاں پر فلسفۂ غالب سے متعلق اس ڈرامے کے دو ایک اقتباس پیش کر کے گفتگو کو آگے بڑھاؤں گا۔ یہ اقتباس ڈرامے کے ایک کردار کے ذریعے پیش کیا گیا ہے:

''ماضی سے متعلق غالب کا تخیل موہوم نہیں ہے لیکن جب بھی غالب اپنے حال کی کیفیات کا حال بیان کرنا شروع کرتے ہیں، ہر کیفیت میں ایک بُعد، ایک دوری سی، ایک دھندلاہٹ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ تصویر سامنے آتی ہے لیکن اس کے نقوش ایک لامحدود پس منظر سے یوں گھلتے ملتے چلے جاتے ہیں کہ تصویر اور اس کے پس منظر کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل

Scanned by CamScanner

ہو جاتا ہے۔''

ایک اور کردار کے ذریعے فیض ان تحریروں پر ڈرامے کو ختم کرتے ہیں:

''غالب کا دور کہہ لو، غالب کا زمانہ کہہ لو، غالب جیسا کہ آپ کو معلوم ہے تاریخ کے ایک بڑے دوراہے پر کھڑا تھا۔ پرانا نظام ٹوٹ چکا تھا اور نئے کی ابھی تعمیر نہیں ہوئی تھی، غالب کے ہم عصروں کو اس تعمیر کی حسرت نہیں، اس کا یارا نہیں تھا۔ پرانے شیرازۂ حیات کو دوبارہ مرتب کرنے کی آرزو نہیں...... غالب ایک ایسے دور کا ترجمان ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ ایک ایسی نسل کا نغمہ جو دفنائی نہیں گئی۔''

مضمون کے جملوں کی تکرار ملتی ہے بلکہ لگتا ہے کہ مضمون ہی کو ڈراما بنا دیا گیا ہے۔ اس شعر پر ڈراما ختم ہوتا ہے۔

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل　　　زنہار گر نہیں ہوسِ ناؤ نوش ہے

اب میں مرزا ظفرالحسن کی مرتب کردہ کتاب لوح و قلم میں شامل غالب سے متعلق چند تحریروں اور تقریروں کے چند اقتباسات پیش کروں گا جس سے فیض کی غالب شناسی کے کچھ اور پہلو سامنے آتے ہیں۔ ادارۂ یادگارِ غالب اور سرسید گرلز کالج کی ایک مشترکہ محفل میں فیض سے غالب پر تقریر کرنے کو کہا گیا۔ یوں تو فیض نثر نویسی اور اس سے زیادہ تقریر سے گھبراتے تھے لیکن غالب موضوع ہو تو حامی بھر لیتے۔ اس تقریر میں بھی وہ پہلے غالب کی ماضی پرستی کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے بعد غالب کے دیوان کے پہلے شعر کے حوالے سے کہتے ہیں:

''نقش یعنی وہ چیز جو کاغذ پر تحریر کی جائے خواہ وہ تصویر کی صورت میں ہو یا تحریر کی شکل میں ہو، اپنے لکھنے والے یا مصور کی فریاد کرتی ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے کاغذ کا لباس پہن رکھا ہے۔ یہ معنی ہر جگہ بتائے جاتے ہیں اور ہر جگہ لکھے ہوئے ملیں گے۔ جو لوگ ذرا باریک بیں ہیں وہ اس شعر کو تصوف کی طرف لے جاتے ہیں اور معنی یہ بتاتے ہیں کہ غالب اپنے خالق کا گلہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو انسان پیدا کیے ہیں یا جو اس کا نقش ہے اس میں اس طرح کی صفات رکھ دی گئی ہیں یا اسے اس قسم کی خوبیاں دی گئی ہیں یا اس کی فطرت ہی اس قسم کی بنائی گئی ہے کہ اسے طرح طرح کی مصیبتیں، مسایل اور مشکلات پیش آتی ہیں اور اس وجہ سے وہ اپنے خالق کا فریادی ہے۔ میری رائے میں اس شعر کے یہ معنی کسی طرح بھی نہیں بنتے کیوں کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ معنی صحیح ہیں تو دوسرے مصرعے میں کاغذی پیرہن کا جو استعارہ ہے وہ پھر مہمل ہو جاتا ہے۔ کوئی انسان کاغذی پیرہن پہن کر نہیں پھرتا۔ کاغذی پیرہن سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ شعر صرف اس تحریر یا تخلیق کے بارے میں ہے جو کہ انسان کرتا ہے نہ کہ اس تخلیق کے بارے میں جو اللہ کرتا ہے۔''

Scanned by CamScanner

غالب کے غیر معمولی شہرت یافتہ اس شعر کی شرح دیگر شرحوں سے کس قدر مختلف ہے۔ فیض کی رسائی شعر اور نزاکتِ احساس کا شعور غیر معمولی تھا البتہ انداز ناقدانہ کم مدرسانہ زیادہ ہو گیا ہے شاید اس لیے کہ وہ تقریر و تشریح ایک کالج میں کر رہے تھے ظاہر ہے کہ وہاں طلبا بھی رہے ہوں گے۔ بہر حال اس خیال سے اتفاق ہو یا اختلاف لیکن فیض کی باریک بینی اور غالب فہمی کی ایک نئی صورت تو اجاگر ہوتی ہی ہے۔ وہ اس شعر کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ ڈوب جاتے ہیں اور لفظ شوخی کی وضاحت یوں کرتے ہیں...... ''اس شعر میں شوخی سے مراد شرارت یا کھلنڈرا پن نہیں ہے۔ شوخی کا مفہوم وہی ہے جسے انگریزی میں ان ٹین سٹی کہتے ہیں۔'' اور پھر اس غزل کے دوسرے اشعار اور بعض فارسی کے اشعار کے ذریعے وہ غالب کے سوزِ نہاں کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سوزِ نہاں کے مختلف پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں۔ غالب نے اس سوزِ نہاں کو مختلف پیرایے میں پیش کیا ہے لیکن یہ بھی لگتا ہے کہ حرف ولفظ غالب کی سوزش کے متحمل نہیں ہیں، اس مقام پر فیض کا ایک گہرا فکری اور تخلیقی تجربہ ان خیالات کو پیش کرتا ہے۔

''الفاظ ایک محدود چیز ہیں۔ آپ کے تجربات اور محسوسات یا آپ جو کچھ دیکھتے ہیں وہ سب غیر محدود ہیں، وہ مرئی یا مادی چیز نہیں ہیں۔ اگر آپ کسی پھول کو دیکھتے ہیں تو اس میں آپ کو رنگ ملتا ہے اس میں خوشبو ہوتی ہے۔ اس کے اردگرد پتے ہوتے ہیں۔ خاص خاص اوقات میں دیکھیں تو دھوپ میں وہ کچھ نظر آتا ہے اور چھاؤں میں کسی اور طرح سے۔ ان ساری باتوں کو آپ دو چار سطروں میں لکھنا یا دو چار جملوں میں بیان کرنا چاہیں تو بہت مشکل ہے کیوں کہ وہ سب باتیں چند جملوں یا سطروں میں نہیں سما سکتیں۔ ان کو پانچ دس اشعار میں بھی بیان نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ الفاظ اور کاغذ دونوں محدود۔ ماڈی اور مرئی چیزیں ہیں اور محسوسات، مشاہدات اور تجربات غیر مرئی چیزیں ہیں۔''

وہ لوگ جو سامعہ کے لسانی فلسفے اور لغت کے ذخیرے کے ذریعے حرف ولفظ کو ہی تخلیقِ اظہار کا اولین حوالہ مانتے ہیں انھیں فیض کے مندرجہ بالا خیالات کو غور سے پڑھنا چاہیے کہ یہ خیالات فیض کے ہیں اور فیض بیسویں صدی کے ایک بے حد اہم اور بڑے شاعر ہیں، دانش ور ہیں اور ہر طبقۂ فکر میں یکساں مقبولیت رکھتے ہیں اسی طرح کچھ اور شعری رموز اور اسرار پر باتیں کرنے کے بعد خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے:

''اجتماعی عذاب کا جو عالم تھا غالب نے اسے اپنے کلام میں سمونے کی کوشش کی اور یہ اتنی بڑی چیز تھی کہ اس کے اظہار کے لیے الفاظ کافی نہیں تھے۔ بڑی شاعری کی یہی علامت اور بڑے شاعر کا یہی ثبوت ہوتا ہے کہ جو مضمون وہ بیان کرتا ہے اس کی وسعت، اس کے عہد کی وسعت کے مقابلے میں کتنی ہے اور اس کے اپنے درد کے علاوہ باقی دنیا اور باقی انسانیت کا کتنا درد اس نے اپنے کلام

Scanned by CamScanner

میں شامل کیا ہے، جتنا زیادہ عظیم اس کا درد ہوگا، اتنا ہی عظیم اس کا کلام ہوگا۔ اس کسوٹی پر غالب پورے اترتے ہیں۔ بلاشبہ غالب بہت بڑا شاعر تھا۔''

اب میں غالب سے متعلق مختار زمن کی انگریزی میں کی گئی گفتگو کے اردو ترجمے کے دو ایک اقتباس پیش کروں گا۔ گفتگو کا پہلا ہی سوال تھا کہ غالب کی عظمت کا راز کیا ہے؟ فیض جواب دیتے ہیں:

''تنوع اور تازگی عظیم شاعری کی خصوصیات ہیں۔ اگر چہ ہر بڑے شاعر کی عظمت کے اسباب یکساں نہیں ہوتے لیکن بعض خصوصیات یکساں ہوتی ہیں۔ غالب کی عظمت کا راز بھی حقایقِ کاملہ سے ہم آہنگی میں مضمر ہے۔''

ایک اور سوال کے جواب میں فیض کہتے ہیں:

''اچھی شاعری کی وہ خصوصیت یعنی تشبیہ واستعارے سے مضمون آفرینی غالب کے یہاں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے ان سب کے علاوہ غالب نے شاعروں کی ستم رانی سے شاعری کو نجات دلائی۔ اس لیے کہ اس نے وہ لفظی شعبدہ بازی ترک کردیں جو مشاعروں کے ان سامعین پر جن کا ردِعمل معلوم ومعروف ہے اثر اندازی کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ اس طور پر اس نے ''بلند سنجیدگی'' کی شاعری کا راستہ ہموار کیا۔''

دیکھیے ستم رانی کا لفظ استعمال کر کے فیض نے روایتی اور لفظی شعبدہ بازی کے حوالے سے ایک نیا پہلو نکالا ہے اور بلند سنجیدگی کی اصطلاح پیش کی ہے۔ اس گفتگو کا ایک جملہ اور پیش کر کے میں اپنی گفتگو کا رخ قدرے تبدیل کرنا چاہوں گا اور مقالے کو ایک اور سمت لے جا کر ختم کروں گا۔ فیض اس گفتگو میں اعتراف کرتے ہیں:

''دیوانِ غالب کا ایک نسخہ ہمیشہ میرے سرہانے رہتا ہے۔ میں اکثر بلکہ بعض حالات میں روزانہ اس کا مطالعہ کرتا ہوں۔ یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ غالب کا منتہی ہوگیا۔ میں اپنی شاعری میں اسے شعوری اور غیر شعوری طور پر استعمال کرتا ہوں۔''

فیض کی غالب فہمی کے کیا ابعاد ہیں اور ان کی غالب شناسی کے کتنے پہلو تنقید کی سطح پر ابھرے ہیں یہ ایک الگ موضوع ہے جس پر میں نے مختصراً گفتگو کی لیکن شعرِ غالب، ذکرِ غالب اور زبانِ غالب کے اشارے واستعارے خود فیض کی شاعری میں کس انداز سے جذب و پیوست ہوئے ہیں، کس نوع سے تحلیل ہوئے ہیں یہ ایک دوسرا موضوع ہے جو تفصیلی اور گہرے مطالعے کا متقاضی ہے جو میرے ناقص ذہن اور کم زور قلم کے ذریعے ممکن نہیں تاہم چند اشارے کر کے میں اپنی گفتگو کو تمام کروں گا۔

اس تجسیم وتحلیل کا پہلا تخلیقی اظہار تو فیض کے پہلے شعری مجموعے کا عنوان ہے نقشِ فریادی۔ غالب نے جن

Scanned by CamScanner

معنوں میں نقش فریادی، کاغذی پیراہن وغیرہ کا علامتی واستعاراتی استعمال کیا ہے، دیکھا جائے تو فیض کی پوری شاعری بدلی ہوئی شکل میں اسی محبت اور فریاد پر ٹکی ہوئی ہے جو آگے بڑھ کر احتجاج کی شکل اختیار کر لیتی ہے، کہیں کہیں للکار اور انقلاب کا جامہ پہن لیتی ہے۔ اداسی، بے چینی، اضطراب دونوں میں مشترک ہے۔

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

اور غالب کا یہ شعر دیکھیے۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کیے ہوئے

باوجود اس کے کہ شخصیت کے معاملات میں غالب اور فیض میں خاصا بُعد اور فرق ہے، غالب کے یہاں شوخی ہے تو فیض کے یہاں خاموشی۔ غالب کے یہاں دھول دھپا بھی نظر آجاتا ہے لیکن فیض محبوب کا سامنا کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ اس لیے کہ غالب شروع ہی سے کھلنڈرے رہے ہیں اور فیض سنجیدہ اور خاموش طبع۔ ان تمام باتوں کے اختلاف کے باوجود غالب کا زندگی کو دیکھنے اور برتنے کا نظریہ، شاعری کا انوکھا تجربہ، نئے نئے خیالات کو نئے نئے انداز میں کہنے کا حوصلہ فیض کو متاثر کرتا ہے اور غیر شعوری طور پر غالب کی طرف مڑ جاتے بلکہ ڈوب جاتے ہیں، جب ابھرتے ہیں تو حالاتِ حاضرہ سے کچھ ایسے رشتے استوار کرتے ہیں کہ کلاسیکیت وقدامت کو جدید فکری نظام دستیاب ہو جاتا ہے۔ دونوں کے تخلیقی وتفکیری انجذاب وامتزاج نے کچھ ایسا رنگ، کچھ ایسا اسلوب اختیار کیا جو سب کا ہوتا ہوا بھی فیض کا اپنا تھا۔ فیض نے حقیقت سے پرے رومان میں بھی نیا انداز اختیار کیا۔ دونوں ہی سطح پر یاسیت وقنوطیت نام کو نہیں، اداسی ضرور ہے جو غالب کی انیسویں صدی کی اداسی سے آگے بڑھ کر بیسویں صدی کی اداسی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ یہی دونوں شاعروں کے امتیازات ہیں کہ صدی کوئی بھی ہو، اداسی ہر صدی میں ایک نئے رنگ روپ میں اثباتی رویوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ غالب نے الم ناک ماحول میں جمال کی تازگی کو باقی رکھا۔ فیض نے ہر مصیبت، ہر موڑ پر محبوب کو اپنے ساتھ رکھا اور یہاں تک کہہ دیا۔

تمھارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک جہاں میں باقی ہے دل داریِ عروسِ سخن
تمھارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک تمھارا دم ہے تو دم ساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں آلام تمھاری یاد سے شیریں ہے تلخیِ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمھارے حسن کے نام

مثالیں اور بھی ہیں جو کوئے یار سے سوئے دار تک پھیلی ہوئی ہیں۔ فیض کے یہاں غالب کی زمین ملتی ہے تو غالب کا آسمان بھی۔ غالب کی فکر ملتی ہے تو غالب کا وجدان بھی۔ اور بہت سارے الفاظ اور تراکیب بھی، لوح وقلم، حلقۂ زنجیر، نجاتِ دیدہ و دل، حکایات خوں چکاں، تہہِ نجوم، پیرہن، مقتل، صبا اور نجانے کیا کیا۔ ایک ادیب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ڈھونڈا جائے تو فیض کے سارے مجموعوں کے نام بھی دیوانِ غالب میں مل جائیں گے۔ ہوسکتا ہے یہ سچ ہو۔ فیض کے حوالے سے ڈاکٹر آغا

Scanned by CamScanner

سہیل کے ان جملوں کو دیکھیے:

''ہاں یہ صحیح ہے کہ دیوانِ غالب کے مطالعے کے وقت فیض نے فکرِ غالب سے اکتساب کیا ہوگا چراغ سے چراغ جلائے ہوں گے۔ فیض کی خوبی یقیناً ہے کہ انھوں نے ایک ذہین آدمی کی طرح غالب سے فیض اٹھایا اور غالب کے افکار ونظریات کو من وعن قبول نہیں کیا، قطع و برید، کتر بیونت اور کاٹ چھانٹ سے بھی کام لیا ہے۔ یہ تو غالب کی ہمہ گیری، آفاقیت اور ہمہ جہت دل آویزی ہے کہ وہ ہر نوع کے افراد کو متاثر کرتے ہیں لیکن بیسویں صدی کے بیشتر دانش ور بقدرِ آگہی غالب سے عام طور پر اور فیض نے خاص طور پر فیض اٹھایا ہے اور اپنے فن کو با اعتبار بنایا۔''

ایک جگہ اور عمدہ بات لکھتے ہیں:

''فیض نے غالب سے کیا فیض اٹھایا اور فکر فیض کا شعر کس منزل تک پہنچا۔ لفظوں کی دروبست کا مطالعہ ضمنی سہی لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ فیض کے شعوری ارتقا میں لفظوں نے بھی ایک کردار ادا کیا ہے۔ فیض کے فکری نظام کی ترسیل میں ان لفظوں کے رنگوں اور عکسوں (Shades) کا بھی عمل شامل ہے۔ لفظوں کا مزاج اور آہنگ فیض خوب پہچانتے ہیں اور نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کرتے ہیں لیکن لفظوں کی خاطر شعر نہیں کہتے۔ شعر کی خاطر لفظوں کا انتخاب کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ فیض کے تخیل سے لفظ دبے رہتے ہیں لفظوں سے تخیل نہیں بنتا۔ یہ بات غالب نے پہچانی تھی مشکل سے مشکل مفاہیم غالب کے یہاں تلاش کیجیے الفاظ اس کے تابع ہوں گے۔ مفہوم لفظوں کے تابع نہ ہوگا۔ (فیض اور غالب)

روسی ادیب ودانش ور لُڈ میلا وامی لیوا' جنھوں نے غالب پر عمدہ کام کیا ہے اور فیض پر بھی، فیض کی کتاب میں فیض اور غالب کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''ابھی تک سب سے پہلے فیض اور اقبال کے روحانی تعلق کی بات ہوتی آئی ہے پھر بھی فیض کی تخلیقات میں غالب ایک بہت ہی خاص مقام رکھتے ہیں۔ فیض کی تخلیقات کلامِ غالب سے بنیادی طور پر پیوستہ ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس سے بہت مختلف بھی ہیں۔ غالب کی طرح فیض بھی کسی طرح کے حقایق اور نظریات کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے تھے بلکہ استعاروں کے ذریعے زندگی کے مظاہر کی ترجمانی کرتے تھے۔ اپنے نظریۂ حیات کی توضیح کرتے ہوئے فیض اکثر غالب کی طرف رجوع ہوتے تھے۔ غالب سے لیے ہوئے استعاروں کو فیض کے کلام میں ایک نیا آہنگ ملتا ہے۔''

حوالے اور بھی ہیں، اشارے بھی اور لیکن میں فیض کے چند اشعار پر اپنی گفتگو تمام کرتا ہوں۔ ان اشعار کو بہ غور

Scanned by CamScanner

ملاحظہ کیجیے۔ حالات پاکستان کے ہیں، حکومت ایوب خان کی ہے لیکن آہنگ غالب کا ہے اور یہی فیض کی انفرادیت ہے کہ سماجی اور سیاسی حالات کیسے دگرگوں کیوں نہ ہوں وہ شاعری کا فن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ غالب کا دامن نہیں چھوڑتے۔

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے ‍ — اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے

گھر رہیے تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے — رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

پیوندِ رہ ، کوچۂ زر ، چشمِ غزالاں — پابوسِ ہوس ، افسرِ شمشاد قداں ہے

یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں — واں جیشِ ہوس تیغ بکف درپئے جاں ہے

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف — مہر اس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن — اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

(ایک شہر آشوب کا آغاز)

Scanned by CamScanner

ڈاکٹر سید صفدر

اقبال کے ریاضِ سخن کی فضائے جاں پرور

اقبال فرماتے ہیں۔

خدائی اہتمامِ خشک و تر ہے　　خداوندا! خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی ، استغفراللہ!　　یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

دردِ سر سے دست برداری اور دردِ جگر کی پاس داری اس بات کا اشارہ ہے کہ اقبال دیگر مصروفیتوں پر شاعری کو ترجیح دیتے ہیں کہ شاعری بھی دردِ جگر کا ایک مظہر ہے۔

خشک ، سیروں ، تنِ شاعر کا لہو ہوتا ہے　　تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

سائنس، فلسفہ، طب، اخلاقیات، مذہبیات اور جملہ علوم، ہوش و حواس کے متقاضی ہیں جب کہ شاعری سوتے جاگتے کا قصہ ہے۔ تمام سائنسی اور سماجی علوم اعیان کی مادّی ماہیت مہیا کرتے ہیں جب کہ شاعری کی مہیا کردہ ماہیت ان علوم کے لیے نا قابلِ قبول ہوتی ہے۔ علمی بیان کسی شئے کا بیانِ واقعہ ہے جب کہ شعری اظہار خلافِ واقعہ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا　　کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا
کلی پہ بیلے کی کس ادا سے پڑا ہے شبنم کا ایک موتی　　نہیں یہ ہیرے کی کیل پہنے کوئی پری مسکرا رہی ہے

چودھویں کا چاند دیکھ کر کوئی یہ کہے کہ سرِ آسماں حسینۂ عالم جلوہ آرا ہے تو یہ بیان خلافِ واقعہ ہوگا یا بیلے کی کلی پر قطرۂ شبنم کی حقیقت یہ ہے کہ ایک پری ہیرے کی کیل پہنے مسکرا رہی ہے تو یہ بیان خلافِ واقعہ ہے۔ یہ شاعرانہ پیرایۂ اظہار

Near Tawakkal Kirana Shop, Taj Nagar No.1, Amravati.

Scanned by CamScanner

ہے۔ یہ طریقۂ اظہار تبلیغِ دین، پند و نصیحت اور تعلیم و تعلم کے لیے کارآمد نہیں ہے اس لیے یہ دعوا کہ 'شاعری جزویست از پیغمبری' غلط دعویٰ ہے۔ کچھ لوگ قرآن کی فصاحت و بلاغت اور مقفیٰ عبارت کے پیشِ نظر قرآن کو شاعری خیال کرتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے ان صفات کو شعر کی ماہیت سے خارج کر دیا۔ فرمایا:

وماعلمنه الشعر' ہم نے رسول ﷺ کو شاعری نہیں سکھائی۔ نہ اللہ کا کلام شاعری ہے نہ رسول ﷺ کا فرمان شاعری ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا: ماکان حدیث یفترا' (یہ کوئی گڑھی ہوئی بات نہیں ہے)

شاعر تو بات گڑھتا ہے۔ اس کا کلام پند و نصیحت، فہمائش، تبلیغ و سدھار کے کام نہیں آتا۔ تمام علوم کا موضوع موجودات ہے۔ شاعر 'عالمِ ناموجود' کی بات کرتا ہے۔ یہ دیکھیے کہ شاعر کس دنیا کی بات کرتا ہے اور کس کیفیت میں شعر کہتا ہے۔

پھر لہو تڑپ اٹھا

اندھے راستوں پہ بے تکان اڑان کے لیے

بند آنکھ کی بہشت میں

سب دریچے، سب کواڑ کھل گئے

اپنی خلق کی ہوئی بسیط سرزمین پر

دھند بن کے پھیلتا سمٹتا جا رہا ہوں میں

خدائے لم یزل کے سانس کی طرح

(قاضی سلیم)

شاعر اپنی خلق کی ہوئی بسیط سرزمین پر عجیب نظارے دیکھتا اور ہمیں دکھاتا ہے۔ ہمارا آپ کا پسندیدہ شاعر اقبال بھی 'اپنی خلق کی ہوئی بسیط سرزمین' کی سیر کرتا ہے اور ہمیں بھی کراتا ہے۔ یہ شاعر کے تخیل کا کمال ہے۔ اسی تخیل کی پرواز سے شاعر کی عظمت قایم ہوتی ہے، مگر پند و نصیحت، وعظ و بیان، اخلاقیات، دینیات، جنت کا شوق، دوزخ کا خوف، اللہ کی ربوبیت، بندگی کے سربستہ راز، بندگی کی اخلاقیات وغیرہ ناک کی سیدھ میں چلنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ کام تخیل کی بے پناہ اڑان کی اجازت نہیں دیتا۔ فلسفہ تو اور بھی غور و خوض اور ہوش و حواس چاہتا ہے اس لیے...... میں اقبال کو بڑا شاعر تو مانتا ہوں علامہ، حکیمِ مشرق، کامریڈ، فلسفی، مصلحِ قوم اور مفسرِ قرآن وغیرہ کہنا پسند نہیں کرتا۔ فلسفیانہ اظہار کے لیے علمِ فلسفہ میں راست بحث کرنی چاہیے، کامریڈ کو کمیونزم پر اظہارِ خیال کرنا چاہیے۔ مصلحِ قوم کو اصلاحی تحریک چلانی چاہیے۔ ان سب کاموں کے لیے شعر کہنے کی ضرورت نہیں ہے جس طرح اصلاحی تحریک چلانے والا مصلح کہلاتا ہے۔ پند و نصیحت کرنے والا واعظ کہلاتا ہے۔ علومِ تفسیر کی روشنی میں قرآن کی تفسیر لکھنے والا مفسرِ قرآن کہلاتا ہے اسی طرح تخیل کی بے پناہ اڑان کے ذریعے اپنی خلق کی ہوئی بسیط سرزمین کی سیر کرنے والا شاعر کہلاتا ہے۔ جو بات شاعر کے تخیل کو ''اندھے راستوں پہ بے تکان اڑان'' کی تحریک نہیں

Scanned by CamScanner

دیتی وہ شاعری نہیں بن پاتی وہ منظوم سپاٹ بیان ہوکر رہ جاتی ہے۔ بہ قول بلراج کومل "خطِ مستقیم شاعری کا دشمن ہے۔"

حالی اپنے مقدمے میں "شعر کا مقابل علم و حکمت کو ٹھہراتے ہیں" کہ علم و حکمت خطِ مستقیم کا سفر ہے نہ شاعری ہے۔ اب کچھ مثالیں اقبال کے یہاں سے خطِ مستقیم کے منظوم بیانات کی ملاحظہ فرمالیں۔ فرماتے ہیں ؎

اٹھو! میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

قوتِ فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے
پھر کسی قوم کی شوکت پہ زوال آتا ہے

یہ راست بیان ہے۔ یہاں اچھی باتیں کرنے کی کوشش ضرور ہے مگر ہر اچھی بات شعر نہیں ہوتی وزن اور قافیے کا التزام بھی بیان کو شعر نہیں بنا سکتا۔ اقبال کے یہاں ایسے منظوم بیانات بہت ہیں۔ سادہ لوح لوگ ان بیانات سے اقبال کا شعری مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے اقبال کو کوئی فلسفی کہتا ہے، کوئی مفسرِ قرآن کہتا ہے، کوئی حکیم مشرق اور نہ جانے کیا کیا خطابات سے نوازا جاتا ہے۔ کم لوگ ہیں جو اقبال کو 'شاعر' سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اب تو علامہ ان کا اسمِ ثانی ہوکر رہ گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اقبال کثیر المطالعہ شاعر ہیں۔ وہ علومِ جدیدہ کے ماہر ہیں۔ ان کا ذہنی پس منظر بہت وسیع ہے۔ اس علمی پس منظر نے اقبال کو فائدہ ہی پہنچایا مگر اقبال کے قارئین کو بے سمت کر دیا ہے۔ اقبال کے ناقدین اقبال کی علمیت سے اتنے مرعوب ہیں کہ ان کے اصل کمال یعنی شاعری تک پہنچنے کی جستجو ہی نہیں کرتے۔ اقبال کا دماغ فلسفی ہے اور دل شاعر ہے۔ اقبال نے اپنے انتخاب میں شاعری کو منتخب کیا ہے جب کہ ناقدینِ اقبال نے اس گوہر (شاعری) سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ان کے علم کا مول بھاؤ شروع کر دیا۔ وہ مولویانِ کرام کے لیے علیہ الرحمہ ہیں سماج سدھارکوں کے لیے مصلحِ قوم ہیں۔ یونی ورسٹی کے اساتذہ کے لیے فلسفی ہیں مگر خود اقبال اپنے انتخاب میں شاعر ہیں۔ اقبال کی ایک مختصر سی نظم ہے..... 'عقل و دل' اقبال کے یہاں مکالمات بہت ہیں۔ یہ نظم بھی ایک مکالمہ ہے۔ عقل اپنی لن ترانیاں سنا چکی تو دل یوں گویا ہوتا ہے ؎

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے
اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

ہے تجھے واسطہ مظاہر سے
اور باطن سے آشنا ہوں میں

علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے
تو خدا جو، خدا نما ہوں میں

شمع تو محفلِ صداقت کی
حسن کی بزم کا دیا ہوں میں

تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا
طائرِ سدرہ آشنا ہوں میں

کس بلندی پہ ہے مقام مرا
عرشِ ربِ جلیل کا ہوں میں

اس نظم کو پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ عقل 'فلسفی اقبال' ہے اور دل 'شاعرِ اقبال' ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفی آگہی چاہتا ہے، شاعر معرفت آشنا ہے۔ فلسفی کا تعلق مظاہر سے ہے، شاعر کا واسطہ باطن سے ہے۔ فلسفہ اقبال کو بے چین رکھتا ہے، شاعری اقبال کی بے چینی

Scanned by CamScanner

کا علاج ہے۔ فلسفی صداقت کی تلاش میں ہے، شاعرِ اقبال حسن کا متوالا ہے۔ فلسفی فرش سے عرش تک سرگرداں ہے، شاعر معراج بہ کنار، یعنی سدرہ آشنا ہے۔ فلسفی خدا کی تلاش میں ہے، شاعر خدا کے حضور میں ہے۔ فلسفی اقبال عقل کے خانے کے مندرجات سے علاقہ رکھتا ہے، شاعرِ اقبال 'دل' کے خانے کے مندرجات سے متعلق ہے۔ اس لیے کلیم الدین احمد کہتے ہیں کہ جہاں اقبال راہِ نجات دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، شاعری کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اب مشتِ نمونے از خروارے، اقبال کے یہاں شاعرانہ تخیل کی کارفرمائیاں ملاحظہ فرمائیے۔ ہم پھولوں بھری وادی یا غروبِ آفتاب کا منظر دیکھتے ہیں، مگر اس تجربے کے حسن کے اظہار سے عاجز ہیں۔ ہم کہتے ہیں اتنا خوب صورت منظر تھا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ اقبال اپنے کرشمہ ساز تخیل کی مدد سے اسے یوں بیان کرتے ہیں۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار اودے اودے نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

وادیِ کوہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

غروبِ آفتاب کا ایک منظر تو اقبال ایسا بیان کرتے ہیں کہ تحیر خیز ڈرامے کا لطف آتا ہے۔

سورج نے جاتے جاتے شامِ سیہ قبا کو طشتِ افق سے لے کر لالے کے پھول مارے

یہاں سورج اور شام دو چاہنے والے ہیں۔ جو دمِ وداع ایک دوسرے کو چھیڑ رہے ہیں۔ سورج افق کی تھال سے، جو لالہ کے پھولوں سے بھری ہے، لالے کے پھول لے کر شام سیہ قبا کی طرف اچھال رہا ہے۔ قطرہ ہائے شبنم پر اردو میں بہت شعر کہے گئے ہیں۔ مثلاً میر انیس کا شعر ہے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

یا

شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

یا

پتے شبنم سے وضو کرتے ہیں

اقبال نے قطرہ ہائے شبنم پر بہت خوب صورت نظم کہی ہے۔ 'حقیقتِ حسن' یہ نظم ایک ڈرامہ ہے۔ عرشِ پاک سے دامنِ خاک تک ایک اسٹیج ہے، اس میں خدا، حسن، قمر، تارے، اخترِ سحر، شبنم، موسمِ بہاراں سب اپنا کردار نبھاتے ہیں۔ نظم ملاحظہ ہو۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا جہاں میں تو نے مجھے کیوں نہ لازوال کیا

ملا جواب کہ تصویر خانہ ہے دنیا شبِ درازِ عدم کا فسانہ ہے دنیا

ہوئی ہے رنگِ تغیر سے جب نمود اس کی وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی فلک پہ عام ہوئی اخترِ سحر نے سنی

سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو

Scanned by CamScanner

چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

اقبال کے تخیل نے ایک دلچسپ پلاٹ خلق کیا ہے۔حسن اور خدا کے درمیان رازو نیاز کی بات ہو رہی ہے۔قریب کھڑے چاند نے کان لگا کر یہ بات سن لی۔معلوم ہوا کہ حسین شئے رنگِ تغیر سے بنائی گئی ہے۔تغیر حسن کا زوال بنتا ہے۔آسمان پر تاروں میں کانا پھوسی ہوتی ہے۔بات اخترِ سحر سے سحر تک اور پھر شبنم تک پہنچتی ہے۔شبنم آسمان سے زمین پر آتی ہوتی ہے۔شبنم نے یہ راز بہار پر کھول دیا۔قطرہ ہائے شبنم کی صورت میں بہار گریہ کرتی ہے۔شباب سیر کے لیے آیا تھا اور سوگوار واپس جا تا ہے۔اقبال اُردو کے اُن معدودے چند شاعروں میں ہیں جن کا ذخیرۂ الفاظ بہت زیادہ ہے۔وہ اس راز سے بھی واقف ہیں کہ الفاظ ''معنی کا گھر''اور وطن ہیں۔اقبال کا علم اور ذخیرۂ الفاظ اُن کے تجربات کی دنیا کو وسیع تر بناتے ہیں۔تجربات کی وسعت تخیل کے تموّل کا سبب ہوتی ہے۔اقبال اپنے علم،اپنے ذخیرۂ الفاظ اور اپنے تخیل کی مدد سے ساری کائنات میں ہماہمی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ان کو ہر طرف حرکت و عمل کی آباد دنیا ئیں نظر آتی ہیں۔اس لیے وہ اعیان میں وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے۔اعیان کو دیکھنے کی ہماری عادت اور ہماری طاقت محدود ہے۔اقبال ہر شئے میں اپنے تخیل کی مدد سے بہت کچھ شامل کر دیتے ہیں۔اس طرح فن پارہ وجود میں آتے ہیں۔شاعر کی ایک تعریف یہ ہے کہ......

گلاب کا پھول گلاب کا پھول ہے

گلاب کا پھول گلاب کا پھول نہیں ہے

پھر بھی گلاب کا پھول گلاب کا پھول ہے

یعنی: گلاب + غیر گلاب = گلاب جو ایک تخلیق شئے پارہ ہے۔معنی کی نئی وسعتوں کو حیطۂ اظہار میں لانے کے لیے اقبال ترکیب سازی سے بھی کام لیتے ہیں۔یہ غالب کا وطیرہ ہے جو اقبال،فیض اور ظفر اقبال سے نئے شعرا تک چلا آتا ہے اور معنی کی بہار کا احاطہ کرتا ہے۔اس ضمن میں اقبال کی ایک نظم ملاحظہ فرمائیں۔

ستارہ صبح کا روتا تھا اور کہتا تھا ملی نگاہ مگر فرصتِ نظر نہ ملی

ہوئی ہے زندہ دمِ آفتاب سے ہر شئے اماں مجھی کو تہہِ دامنِ سحر نہ ملی

بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی نفس حباب کا تابندگی شرارے کی

کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبینِ سحر غمِ فنا ہے تجھے گنبدِ فلک سے اتر

میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی بنا مثالِ ابد پائیدار ہے اس کی (اخترِ صبح)

اس مختصر نظم میں کئی ترکیبیں استعمال ہوئی ہیں فرصتِ نظم،دمِ آفتاب،تہہِ دمِ سحر،نفس حباب کا،تابندگی شرارے کی،زیورِ جبینِ سحر،غمِ فنا،گنبدِ فلک،بلندیٔ گردوں،،ہمرہِ شبنم،ریاضِ سخن اور مثالِ ابد نگاہ کا ملنا مگر فرصتِ نظر سے محروم رہنا دمِ آفتاب سے ہر شئے کا جی اٹھنا مگر اسی چیز کا صبح کے ستارے کے لیے موت کا سبب ہو جانا کیسے حیرت انگیز بیانات ہیں۔شاعر نے تضادات کے ذریعے محزونی کو فزوں تر کر دیا ہے۔پھر ریاضِ سخن کی فضائے جاں پرور کا تعارف ہوتا ہے۔ہمارے غم اور ہماری خوشیوں کا فن کے سانچے میں ڈھل کر مثالِ ابد پائیدار ہو جانا نظم کو ایک نئی کروٹ دیتا ہے۔یہ شاعر اقبال کی کارگزاری ہے۔اقبال کے ریاضِ سخن کی فضائے جاں پرور کا ثمرہ ہے۔

❀❀❀

Scanned by CamScanner

معید رشیدی

جیسے میر کہتے ہیں صاحبو!......قاری کی میزان پر

متن ایک ایسی شراب، یا زہر، یا دوا ہے، جس کا اثر، اور اکثر بہت ہی معمولی اثر، دیر میں ہوا کرتا ہے اور اگر، کبھی کبھار، یہ رگوں میں شعلے کی مانند دوڑ جاتی ہے تو نطشے کی مانند، قاری کو بے حال ہو جانا پڑتا ہے،...... یوں ہی لکھنے والا فریب، دھوکے، بے ایمانی، شاطرانہ پن، معصومیت، رذالت، کمینہ پن، نقل اور جانے کن کن عیب اور خوبیوں کو استعمال کرتا ہے، کیوں کہ وہ فکشن کے چکر میں پھنس کر رہ گیا ہوتا ہے، جو کہ نہ تو حقیقت اور نہ داعیہ، پھر بھی حقیقت بھی ہے اور داعیہ بھی، مایا بھی اور الیوژن بھی،..... لکھنا یا تصویریں بنانا، دراصل ایک سورئیل عمل ہے۔ لکھتے رقعہ، لکھ گئے دفتر، اسی قسم کا احساس و کیفیت ہے، یا یہ کہ 'آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں'۔ لکھنے والا ہمہ وقت ہوش سنبھالنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، لیکن اکثر کاغذ کا ایک ٹکڑا آن کر، ایک عجیب سی خوشبو پھیلا کر، ایک دلنواز ہنسی کی کھنک، ایک شیر کی چنگھاڑ، اہرمن کا مہیب قہقہہ، ریل گاڑیوں کی چیخم دھاڑ، ننھے سے بچے کا ماں کی گود سے پھسل کر پختہ فرش پر گر جانا، ساری کی ساری باتیں اسے بدحواس کر جاتی ہیں، یا گل بنا جاتی ہیں۔ قاری بھی ایسے ہی احساسات سے ہو کر گزرتا ہے، اور پڑھتے وقت اپنے احساسات اور ادیب کے احساسات کو یا تو ایک دوسرے میں ضم کرنے کی کوشش کرتا ہے، یا پھر نطشے کی مانند، اس کی مخالفت کرتا ہے۔ سود و زیاں کا یہاں سوال نہیں۔

اقتباسِ بالا، متن اور قاری کے رشتے کی وضاحت کرتا ہے۔ بین المتونیت نے قاری کے ذہن کو کشادگی عطا کی

169, Sabarmati,J. N. U., New Delhi-110067.

Scanned by CamScanner

ہے۔ متن بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی جڑیں دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ قاری متن کے معنوی امکانات کی بھول بھلیوں میں خود کو گم پاتا ہے، لیکن عطر کشید کرنے کی للک اسے بے تاب کیے رہتی ہے اور وہ مسلسل غور و فکر کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنے کی سعی کرتا ہے۔ فکشن کے بیانیے میں بوقلمونی کا احساس، متن کی مختلف سطحوں پر دیدہ دلیری کی دعوت دیتا ہے۔ بوقلمونی کا یہ احساس اگر شدت اختیار کر لے اور اگر متن کسی ناول کا ہو، اور ناول بھی ایسا کہ وسیع کینوس اور مربوط بیانیے کا طالب ہو، تو یقیناً قاری کو خاطر خواہ سنجیدگی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اس سنجیدگی میں تجسس اور جرأت کی آمیزش کے بعد قاری کا ذہن متن کی پرتوں کو کھرچنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے، جس سے وہ محظوظ بھی ہوتا ہے اور مبہوت بھی۔ آگے بڑھنے سے قبل مندرجہ بالا اقتباس پر پھر نظر ڈالیں اور پہلی نگاہ میں قیاس کریں کہ یہ کہاں سے ماخوذ ہو سکتا ہے؟ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ کسی تنقیدی کتاب سے مقتبس نہیں ہے۔ دراصل یہ فکشن کے بیانیے کا ایک حصہ ہے، جو حبیب حق کے ناول 'جسے میر کہتے ہیں صاحبو!'' سے مستعار ہے اور جو تخلیق کا[illegible] کر نظریے کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ متن اور قاری کے رشتے کا ادغام ضروری ہے۔ [illegible]ں لازم و ملزوم ہیں۔

ناول کی شعریات کا لحاظ رکھتے ہوئے تخلیق کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا یقیناً کارِ دشوار ہے لیکن یہ کارِ دشوار، کارِ ناممکن نہیں۔ تخلیق نازک ترین راہ ہے جس پر چل کر اعلیٰ منازل طے کرنا مشکل ہے۔ ان تمام مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اور تخلیق کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے، فن پارے کو عمدہ صورت عطا کرنا کسی سادہ ذہن کا کام نہیں۔ حبیب حق کے ناول ''جسے میر کہتے ہیں صاحبو!'' کے مطالعے کے بعد بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ مصنف کا ذہن نہایت متنوع، بالیدہ اور پختہ ہے اور یہ پختگی وسیع مطالعے اور تجربات کی بھٹی میں تپ کر حاصل ہوئی ہے۔ مصنف کا ذہن مشرقی اور مغربی مزاج سے ہم آہنگ ہی نہیں، بلکہ امتیاز کی صلاحیتوں سے بھی مملو ہے۔ موصوف نے تمام عمر سائنس پڑھی اور پڑھائی۔ سائنسی مسایل دامن گیر رہے۔ بائیوکیمسٹری کے پروفیسر رہے، اس لیے تجربہ گاہ کی حرارت بھی خوب خوب حاصل کی۔ ایک عرصہ بیرون ممالک میں رہ کر قوتِ مشاہدہ کو تیز تر بنایا۔ انگریزی میں شاعری کی۔ مضامین بھی لکھے اور اپنے تمام تجربات، مشاہدات اور مطالعات کی روشنی میں ایسا رنگا رنگ ناول سپردِ قلم کیا جو اردو ناول کی تاریخ میں اپنے اسالیب اور محتویات کے اعتبار سے یادگار رہے گا۔ یہ نہ صرف موضوعاتی اعتبار سے بسیط ہے، بلکہ فکری سطح پر بھی عمیق ہے۔ ہم بلا جھجک کہہ سکتے ہیں کہ یہ مشرقی اور مغربی تہذیب کا دلکش اور بہترین امتزاج ہے۔ ناول نگار کا ذہن متوازن اور سلجھا ہوا ہے۔ سیکڑوں صفحات پڑھ جائیے، کہیں بھی قلم ہاتھ سے چھوٹتا ہوا محسوس نہیں ہوتا۔ یہی نہیں، بلکہ ان میں مہمیز کرنے کی صفات بھی ہیں، جو عمدہ اور اعلیٰ ناول کا وصفِ خاص ہے۔

میر صفدر حسین علوی ناول کے مرکزی کردار ہیں، جو ناول میں میر صاحب، پروفیسر علوی یا صرف صفدر کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ نیویارک یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔ انھوں نے اسلامی تصورات و نظریات کا جس قدر گہرا مطالعہ کیا تھا، بہت ممکن تھا کہ ایسی صورت میں وہ فرشتہ صفت ہو کر رہ جاتے لیکن ان کے اندر انسانی سرشت کی آنچ

Scanned by CamScanner

تیز تر ہے۔خیر وشر کی کسی ایک مخصوص عینک سے ان کی شخصیت کا نظارہ نہیں کیا جا سکتا۔دیگر کرداروں میں پرشوتم، پروفیسر بنرجی، مدھو سودھن، میاں اقتدار حسین، مسٹر اپاجی راؤ، شیریل، ساونڈرس، گل ریز خاں، فاروق صدیقی، متین صدیقی، الطاف بلخی، مسٹر اگروال وغیرہ شامل ہیں۔

میں کرداروں کے تعارف سے صفحات سیاہ کرنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ناول کے وسیع کینوس پر کردارو ں کی چلتی پھرتی اور حسب حال تصاویر پیش کی گئی ہیں۔ان کی نفسیات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔بعض تصاویر ادھوری ہیں لیکن اس میں ناول نگار کا قصور نہیں کیوں کہ ناول کی فضا میں وہ ضمنی طور پر نمودار ہوئی ہیں۔تصویر کا یہ ادھورا پن فنی طور پر کوئی ضرب نہیں لگا تا۔ناول نگار کی خوبی یہ ہے کہ ضمنی کرداروں کو بھی گلدستے کے مختلف اور رنگا رنگ پھولوں کی طرح سجایا ہے تا کہ گلدستہ بھرا بھرا، خوبصورت اور جاذب فکر ونظر ہو۔کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی کردار فاضل ہے یا اس کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔حسب موقع تمام کردار اپنے افعال انجام دیتے ہیں۔ناول نگار پر قطعی یہ ذمے داری عاید نہیں ہوتی کہ وہ تمام کرداروں کو فر شتہ خصلت بنا کر پیش کرے یا چند کو شیطان صفت بنا کر لائے تا کہ خیر و شر کا معیار قائم ہو اور کوئی اخلاقی سبق حاصل کیا جا سکے۔ادبی تخلیق شعور سے زیادہ وجدان اور ایک مخصوص قسم کی محویت کا تقاضا کرتی ہے اور اس عالم محویت میں تخلیق کار کا قلم تخلیقیت کی مست روشنائی میں غرق ہو کر اس طرح صفحۂ قرطاس پر جلوہ بکھیرتا ہے کہ تخلیق کار اور تخلیق کے مابین دیواریں منہدم ہوتی جاتی ہیں اور تکمیل کے بعد عقل انگشت بدنداں رہ جاتی ہے۔جنوں مسرت سے سرشار ہو کر مسکرا اٹھتا ہے۔

آج فکشن کی تنقید بھی سکہ بند ہو کر رہ گئی ہے۔اگر افسانے یا کسی ناول پر مضمون لکھنا ہے تو فارمیٹ تیار ہے۔بس فٹ کرتے جائیے اور مضمون تیار۔چند عناصر ہیں، جن کی شناخت کیجیے، مسئلہ حل ہو جائے گا۔مثلاً کردار نگاری کیسی ہے۔مکالمے چست ہیں یا نہیں۔منظر نگاری میں فن کار کس حد تک کامیاب ہے۔جزئیات کے باب میں مصنف کا قلم کتنا دیدہ ریز واقع ہوا ہے۔زبان کیسی ہے۔نفسیات نگاری میں تخلیق کار نے کون کون سے تیر مارے ہیں۔پیشکش کس طرح کی ہے۔جذبات نگاری کا معیار کیا ہے۔یہ وہ عناصر ہیں جو بالکل سامنے کے ہیں اور فکشن کی تنقید کا ایک مبتدی بھی انھیں جانتا ہے کہ فکشن پر مضمون یوں لکھا جائے کہ کردار سادہ ہیں یا پیچیدہ ہیں یا دونوں طرح کے ہیں۔اچھے ہیں یا برے ہیں یا دونوں قسم کے ہیں۔کردار نگاری میں مصنف نے کمال کر دیا ہے۔جزئیات نگاری میں عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے یا اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔زبان صاف ہے۔دلکش ہے۔نفسیات اور جذبات نگاری میں موصوف نے قلم توڑ دیا ہے یا یہ انھی کا حصہ ہے۔اس قبیل کی تنقید اکثر طفلانہ، احمقانہ اور غیر سنجیدہ معلوم پڑتی ہے۔ہم ان عناصر کی تلاش یا ان سے متعلق رائے زنی کے مخالف نہیں ہیں یا ناول میں ان عناصر کی موجودگی کا انکار نہیں کرتے۔ہم تو فقط اس طرز کی باتوں کی فریم ورکنگ اور انھیں پر قانع رہ جانے کو غیر مناسب اور غیر مستحسن سمجھتے ہیں۔اسٹیریو ٹائپڈ (stereotyped) تنقیدی ماڈل سے احتراز ضروری ہے۔ہم تو متن کے ساتھ ماورائے متن کی بات کرتے ہیں کہ سوچ کی کھڑکی کبھی بند نہیں ہوتی اور مذکورہ عناصر کے علاوہ بھی

Scanned by CamScanner

بہت کچھ تلاش کیے جاسکتے ہیں، جن سے فن پارے کے معیار کا فیصلہ کیا جانا چاہیے۔ ہوائی باتوں سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ غیر سکہ بند، عملی اور نظری طور پر فن پارے کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے تو بہتر نتائج کی امید کی جاسکتی ہے۔

حبیب حق نے نہ صرف کرداروں کو واقعات سے جوڑا ہے بلکہ ان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ تخلیق کار کرداروں کی تشکیل پر مکمل طور پر قابض نہیں ہوتا کہ وہ جس طرح چاہے کرداروں کو پیش کردے۔ تشکیلی عناصر کو تخلیقی مراحل طے کرتے ہیں اور وہ جامد نہ ہوکر نمو پذیر ہوتے ہیں۔ صرف توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ فن کار کو پس منظر اور پیش منظر کے مختلف مراحل سے یہ آگہی حاصل ہوتی ہے کہ کیوں کر کرداروں کی تکمیل ہو اور کیسے ان کی شخصیت کو نیچرل بنایا جائے۔ اس لیے کہ فکشن میں حقیقت کا التباس انتہائی ضروری ہے۔ یہاں ناممکنات کے بجائے ممکنات کی بات اہمیت اختیار کرتی ہے۔ یہاں 'کیا ہے' کے ساتھ 'کیا کیا ہوسکتا ہے'، پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جتنی باتیں فن پارے کا حصہ بنی ہوں، تخلیق کار ان سے گزر چکا ہو۔ فن کار تخیل کی مدد سے واقعات، کردار اور دیگر خصایص خلق کرتا ہے۔ جذبے کی صداقت و شدت اور قوتِ مشاہدہ اسے کمک پہنچاتی ہے۔ حبیب حق کے تجربات بھی وسیع اور مشاہدات بھی تیز ہیں۔ قلم پر قابو بھی ہے۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ غیر ضروری باتوں کی تفصیل میں ناول نگار قاری کو الجھا دیتا ہے جس سے بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ اس ناول میں غیر ضروری تفصیلات کا احساس بہت کم ہوگا۔ جہاں تفصیل کی ضرورت پڑی ہے وہ مخصوص واقعے کی پیداوار ہے۔ اس لیے غیر ضروری نہیں ہے لیکن یہ کہنا قطعی غیر مناسب ہے کہ جہاں جہاں تفصیل آئی ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور قاری کو کسی طرح کی بیزاری نہیں ہوتی۔ اگر قاری کو بیزاری یا اکتاہٹ کا احساس ہوتا ہے تو وہ تفصیلات کی وجہ سے نہیں بلکہ بیانیے کے سادہ اور سپاٹ پن کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس ناول کے بیانیے میں بعض تفصیلات ایسی آئی ہیں جو بالکل سپاٹ لہجے میں بیان کی گئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محض علمیت کا اظہار ہے یا تو عجلت کا نتیجہ ہے یا فقط معلومات فراہم کرنا مقصود ہے۔ یہ پہلو یقیناً سنجیدگی چاہتا ہے مگر دوسری طرف یہ بھی تو دیکھیں کہ اس ناول کی ضخامت کیا ہے۔ اس کا پلاٹ کتنا وسیع ہے۔ اس کی فکر کتنی متنوع ہے۔ گیارہ سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس ناول کے ہر صفحے پر آپ تنقید کا خنجر چلائیں گے تو عمل جراحی میں کچھ فاسد مواد تو ضرور مل جائے گا لیکن اس کی ضخامت اور پلاٹ کی وسعت کو بھی ذہن میں رکھیے۔ یہی کم بڑی بات نہیں کہ پورا ناول باہم مربوط ہے لیکن صرف مربوط ہونا کسی ناول کی بڑائی یا کامیابی کی شرط نہیں ہے۔ اور آگے بڑھیے۔ اس کی تہوں میں اتریے۔ نشیب و فراز سے گزریے۔ پھر دیکھیے کہ کن پہلوؤں سے سابقہ پڑتا ہے؟ دنیا کتنی نئی اور کتنی متجسس ہے؟ بودلیئر نے کہا تھا کہ ''غار کی تہہ میں کود پڑو، چاہے وہاں جنت ہو یا جہنم .... نامعلوم حقیقت کی گہرائیوں میں تا کہ کوئی نئی چیز ہاتھ آسکے''۔ نئے پن کی جستجو جمالیاتی تجربے سے دوچار کرتی ہے۔ متن بھی ایک غار ہی ہے جس کی نامعلوم گہرائیوں میں صاحب ذوق قاری اتر کر متحیر ہوتا ہے۔ فکری اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے یہ تحیر بھی فن پارے کو وقعت بخشتا ہے اور جس سے معنوی جہات بھی روشن ہوتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

ناول نگار نے راست و پیچیدہ بیانیہ کے دونوں انداز کو روا رکھا ہے۔ اس ناول میں اکثر سادہ بیانیہ بھی لطف دے جاتا ہے۔ تشبیہات، استعارات اور علامتوں کا بھی عمدہ استعمال ہوا ہے۔ ڈرامائیت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گویا آرٹ و کرافٹ کا امتزاج ہے۔ پلاٹ پیچیدہ ہے۔ ساڑھے پانچ سو صفحات تک قاری کا ذہن بالکل مانوس ہو جاتا ہے اور میر صاحب مرکزی کردار کی حیثیت سے چھائے رہتے ہیں لیکن اچانک کہانی کروٹ لیتی ہے اور ہندوستان میں شیخ صدیقیوں کی تاریخ میں صفحات سیاہ کیے جاتے ہیں۔ اسی پس منظر کی کوکھ سے دوسری کہانی جنم لیتی ہے جس کا سرا بعد میں جا کر پہلی کہانی سے مل جاتا ہے۔ ساڑھے نو سو صفحات تک دوسری کہانی غالب رہتی ہے اور میر صاحب پردۂ خفا میں چلے جاتے ہیں لیکن ناول نگار نے ایسی تکنیک کا استعمال کیا ہے کہ اجنبیت یا دوری کا احساس کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں قوسین میں میر صاحب کے حوالے سے کچھ باتیں تحریر کی گئیں ہیں کہ ایسے ماحول میں وہ ہوتے تو کیا کرتے یا کیا کہتے۔ اس تکنیک سے قاری کا ذہن بندھا رہتا ہے اور دولختگی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ ناول کا آغاز غائب راوی کرتا ہے:

> میر صاحب کو نئی دنیا میں آئے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے۔ انھوں نے حالات سے سمجھوتا کر رکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کا سراغ لگا چکے تھے اور کوئی سی انوکھی بات کبھی بھی انھیں تعجب کے اتھاہ سمندر میں غوطہ لگانے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن کئی بار ایسے واقعات ہو گزرے کہ میر صاحب شطرنج میں ہارے ہوئے کھلاڑی کی مانند محض آنکھیں پھیلائے دیکھتے رہ گئے۔ عجیب سی شے ہے یہ دنیا! اور کائنات عجیب تر! سائنسی رسالوں میں وہ کائنات کی ابتدا، وسعت، بوقلمونی اور حسن کے بارے میں پڑھتے اور ششدر رہ جاتے۔ اور کبھی کبھی سوچا کرتے کہ انسانی ذات شاید کائنات سے بھی عجیب تر اور گنجلک ہے۔ آنکھیں ان کے پاس تھیں اور جوشیں مارتا ذہن! وہ سمجھنا چاہتے تھے اور سمجھ بھی رہے تھے پر تعجب سے کنارہ کشی رکھنا چاہتے تھے۔
>
> (جسے میر کہتے ہیں صاحبو!، ص:۱۶)

ناول کا ایک بڑا حصہ تاریخ سے تعلق رکھتا ہے، لیکن یہ تاریخی ناول نہیں ہے۔ اس کے متعدد حصے تخلیقی غیر فکشن (Creative non-fiction) کے ذیل میں آتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> مشرقی اتر پردیش کے شہر غازی پور سے کوئی دس میل شمال مغرب ایک قصبہ ہے، شیخ پورہ جس کا نام ہے۔ اب تو وہ تقریباً ویران ہو چکا ہے اور اہیروں اور گوالوں نے وہاں اپنا تسلط جما لیا ہے۔ پر وہ کبھی ایک مردم خیز خطہ تھا۔ یہ ثقافتی رجحانات کا ترجمان، اسلامی علوم پر فکر کرنے والوں کا قصبہ، اس قصبے کو شیخ صدیقیوں نے اورنگ زیب کے آخری عہد میں آ کر گلزار کیا اور ۱۹۴۷ء تک وہ یہاں کے نامور زمین دار رہے۔ لارڈ کارنیوالیس کے پرمننٹ سٹلمنٹ نے ان کو مددِ معاش میں دی گئی

Scanned by CamScanner

زمینوں کے مالکوں کو زمین داروں کا سرکاری اور قانونی رتبہ بخشا اور وہ کبھی بھی اودھ کے تعلقہ داروں سے کسی بھی سلسلے میں کم نہ رہے۔ان کے یہاں کم از کم لکھنؤ کے نوابان اودھ کے زمانے تک حویلی کے سامنے ہاتھی جھومتے تھے۔

(جسے میر کہتے ہیں صاحبو!،ص:۵۵۱)

ہندوستان میں شیخ صدیقیوں کی آمد کی تاریخ سے لے کر ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور پھر تقسیم ہند تک کے حالات و واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔تہذیبی ادغام سے لے کر تہذیبی تصادم کا عکس دکھایا گیا ہے۔مشترکہ کلچر کے گوناگوں پہلوؤں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔میر صاحب کو اسلامی تاریخ کے اسکالر کی حیثیت سے پیش کر کے اسلامی تاریخ اور ہند اسلامی روایات کی عقدہ کشائی کی گئی ہے۔پورے ناول پر تصوف اور عارفانہ افکار کی جلوہ سامانی دیکھی جا سکتی ہے۔فنا اور بقا کے مسایل نے سر اٹھایا ہے۔ناول نگار نے اسلامی تاریخ،ہند اسلامی روایات،مشترکہ ثقافت،لسانی ہم آہنگی،صوفیانہ عقاید،مذہبی افکار،نسلی ارتقا،نسبی عصبیت،مغربی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کی رنگا رنگی سے ناول کا تانا بانا بنا ہے جس کی بنت میں تخلیقی رچاؤ اور فکری ارتباط کے عناصر ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔شیخ صدیقیوں کے تاریخی دھارے میں صوفیا اور قلندروں کا ذکر بار بار آیا ہے۔سید احمد شہید کی وہابی تحریک اور مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال سے متعلق باتیں معقولات اور منقولات کے دائرے میں آئی ہیں۔صدیقیوں کی نسبی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے موصوف رقم طراز ہیں......''حضرت ابو بکر صدیق کی وجہ سے یہ صدیقی کہلانے۔''انھوں نے ابتدا میں احادیث رسول،اسماء الرجال اور فقہ میں ید طولی حاصل کیا تھا۔فلسفہ و منطق کے حوالے سے ابونصر فارابی،شیخ بوعلی سینا،ابوحامد الغزالی وغیرہ کا بھی ذکر موجود ہے۔ہندوستان میں چشتیہ سلسلے کے اثرات اور اسلام کے فروغ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ہند ایرانی تہذیب و تادیب،سبک ہندی کے اثرات اور ہندوی (اردو) کی تشکیل و مقبولیت کے پہلو بھی چمک اٹھے ہیں لیکن تمام موضوعات تخلیقی آہنگ سے مرتب ہیں۔ملاحظہ ہو:

> یہ ثقافت جو ہندوستان میں صوفی حضرات کے آنے کے بعد اور محمود غزنوی کے حملوں کے بعد رفتہ رفتہ وجود میں آئی تھی۔اس نے ہندوستان کو گویا ایک بار پھر ثقافت کی راہ پر لگا دیا تھا۔زبانوں میں تبدیلیاں آ رہی تھیں۔ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے،فارسی کے اثر کے ذریعہ ہندوستان میں ایک خوبصورت زبان نے جنم لیا تھا جسے ہندوی کہتے تھے یا ہندی اور جس کی کشش اور جس کی مٹھاس سب پر چھائی جا رہی تھی۔یہ ایک ایسا مزہ تھا،یہ ایک ایسی مہم تھی جس نے شیوا جی جیسے غیور سردار کو مجبور کیا کہ وہ ان ہی لباس،ان ہی تراش خراش،ان ہی طریقوں کے ساتھ اپنے مغل دشمنوں کا مقابلہ کرے جس طور پر وہ تھے۔ہندوستان نے ایسی تہذیب،ایسی جامع گیریت، مدتوں بعد دیکھی تھی اور اگلے ڈھائی سو سال تک اسے گلے سے لگائے رہے گی۔

Scanned by CamScanner

(جسے میر کہتے ہیں صاحبو! ص:۵٦۴)

ناول کا خاصا حصہ شیخ صدیقیوں کی علمی اور مذہبی خدمات کا احاطہ کرتا ہے۔ان خاندانوں میں مولوی حضرات نے خود کو بحرِ علوم میں غرق کر لیا تھا۔انھوں نے عربی قواعد،مصادر،ڈکشن اور نحو کو اپنی زندگی بنالی تھی۔ان ہی میں سے بعد کی نسل کے کچھ لوگ مذہبی اعتبار سے بے راہ روی کے شکار ہو گئے اور عمل سے بالکل کٹ گئے۔میر صفدر حسین علوی،عبید صدیقی،فرخندہ بیگم،روحی فخرالزماں وغیرہ ایسے کردار ہیں جو اس خیال کے نمایندہ ہیں۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخی خدمات،اس کا مخصوص کلچر،سرسید تحریک،انگریزی حکومت اور انگریزی تعلیم و طرزِ رہائش سے رغبت،انگریزوں کے مظالم، علمائے دیوبند کا موقف،ہندو احیا پرستی،دیوناگری رسم خط اور اردو ہندی تنازع جیسے موضوعات بھی ضبطِ تحریر میں آ کر تخلیقی بنت کا حصہ بنے ہیں۔مسلم گھرانوں میں تعلیمِ نسواں کا میلان،عورتوں کی نارسائی،ان کے ناز و نخرے،حسن کی آرائش، 'گلستاں' 'بوستاں' کی درسی روایت،شرر،راشد الخیری،وغیرہ کے تاریخی و اصلاحی ناول کے مطالعے کا چلن،شعر و ادب سے دلچسپی،'انوار سہیلی'،'عیارِ دانش' اور 'داستان امیر حمزہ' کی قرأت کا عام رجحان،مسلم گھرانوں کے ایسے گوشے ہیں جن سے ناول میں مخصوص فضا کی تشکیل کی گئی ہے۔ناول کے چند ابواب لکھنؤ کی زوال پذیر تہذیب کے ترجمان ہیں۔عیش و عشرت، ساغر و مینا،شباب و کباب،نشست و برخاست،آدابِ محفل،مجلسِ شعر و سخن،طوائفوں کے کوٹھے اور تہذیب کے روشن چراغ، موسیقی،سماع و جماع،رقص کی ہنرمندی جیسے امور کے ساتھ زیورات اور ملبوسات کی بھی تفصیل پیش کی گئی ہے۔یہاں چند اقتباسات پیش کرنا غیر مناسب نہ ہوگا:

> رقص و موسیقی کا پروگرام رات گئے تک چلتا رہا۔صاحب میاں نے گلوریاں کھائیں۔حقے کے کش لگائے۔چند حضرات سے ادھر اُدھر کی باتیں کیں،خود کو نئے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش کی اور انھیں احساس ہونے لگا کہ یہاں رقص اور موسیقی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہو رہا ہے۔
>
> (جسے میر کہتے ہیں صاحبو! ص:٦١۴)
>
> حقیقت تو یہ ہے کہ اب بھی مشتری بائی قتالۂ عالم میں سے تھیں۔ان کے عشق کے چرچے سارے لکھنؤ میں مشہور تھے۔وہ زیادہ تر نامی گرامی اصحاب سے دل لگایا کرتی تھیں۔ان کے دل لگانے کے فواید،لامحالا طور پر،بے شمار تھے۔ان کا جسم بھرا بھرا اور دل گداز تھا۔ہونٹ رسیلے تھے،گو ان کے اندر انتخاب کرنے کی سی کیفیت پائی جاتی تھی۔
>
> (جسے میر کہتے ہیں صاحبو! ص:٦٢٢)
>
> ادا کرنے کا طرز کچھ عجب سا تھا۔صاف تلفظ۔الفاظ پر گرفت مکمل۔ادائیگی کس سادگی اور کمال کی تھی۔آنکھوں کے ذریعے مطالب بتائے جا رہے تھے کچھ یوں کہ جیسے شاعر نے خود آن کر معانی

Scanned by CamScanner

ظاہر کیے ہوں۔ خالص فارسی انداز کی غزل تھی۔

(جسے میر کہتے ہیں صاحبو!،ص:۶۷۱)

رنڈیوں میں ایک بات ہوا کرتی ہے۔ان کے اندر تہذیب کا مادہ ہوتا ہے،ایک شائستگی ہوتی ہے، ایک خوش اطواری ہوتی ہے۔ایک انسان نہ صرف ان سے عام دنیاوی امور کے بارے میں سیکھ سکتا ہے بلکہ تہذیب وآداب،زندہ دلی اور خوش مزاجی،شعروشاعری،صفائی اور ستھرائی ان کے ہاں سے حاصل کی جاسکتی ہے۔اوراس سلسلے میں لکھنؤ کی طوائفیں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔

(جسے میر کہتے ہیں صاحبو!،ص:۶۵۲)

لکھنؤ کے ذکر میں ان تمام باتوں کے علاوہ منشی نول کشور کی خدمات،علمی وادبی رجحانات،پرانی کتابوں کے قدیم نسخوں کی طباعت،تہذیبی ساخت کی ناپائیداری اور رسم ورواج کا بیان چابک دستی سے کیا گیا ہے۔انگریزوں کی کارستانی سے مشترکہ کلچر میں پھوٹ پڑنے کے بعد تقسیم ہند کا منحوس دن بھی دیکھنا پڑا۔انگریزی حکومت میں سرکاری نوکری،غلامی کی ذہنیت،انگریزوں سے مہذب ہندوستانیوں کے تعلقات کی نوعیت،انگریزی زبان سے مرعوبیت،طرز زندگی میں انگریزوں کی تقلید وغیرہ کا اظہار تاریخی صداقتوں کے پیش نظر کیا گیا ہے۔خلافت تحریک،جنگ بلقان اور ہندوستانی مسلمانوں کے احساسات،کانگریس کی پالیسی،گاندھی جی کے ترکِ موالات اور عدم تعاون کی تحریک کا قضیہ،برٹش انڈیا کے وفاقی نظام کے مباحث،ڈانڈی مارچ،گول میز کانفرنس،ویرساورکر،سرسید اور قومیت کا مسئلہ،جناح کی سیاست میں واپسی اور مسلم لیگ کے مطالبات،علامہ اقبال اور مسلم لیگ کا خطبۂ صدارت،مولانا آزاد کی ولولہ انگیزی،نہرو کی قیادت،ہندوستان چھوڑو تحریک، فرقہ ورانہ فسادات اور آخر میں تقسیم ہند کے متعلقات جنگ آزادی کی تحریک کی تصویر کشی کرتے ہیں۔فخر الزماں صدیقی ناول کے اہم کردار ہیں۔مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز ہیں۔نواب زادہ لیاقت علی خاں نے جب انھیں پاکستان آنے کی دعوت دی،تو ایک مسلمان کی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا:

جناب میں اس صوبے کا رہنے والا ہوں۔تمام عمر یہیں نوکری کی۔یہاں کے بارے میں تھوڑی بہت واقفیت رکھتا ہوں۔میری یہاں زمین ہے۔مکانات ہیں۔بال بچے ہیں۔دوست احباب ہیں۔گومتی ندی ہے۔امام باڑہ ہے۔ملیح آباد کے آم ہیں۔قنوج کے تربوز ہیں۔پنجاب،سندھ اور صوبۂ سرحد کے متعلق میری واقفیت کم ہے۔میں کچھ دنوں بعد ریٹائر ہو کر اللہ اللہ کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں مجھے نئی زندگی کی ابتدا کرنی ہوگی جو کہ مجھ سے ممکن نہ ہو سکے گا۔پھر میں تو اررلیونٹ ہو کر رہ جاؤں گا۔آپ جناب اگر مجھے معاف فرمائیں تو میں مشکور رہوں گا۔مجھے پاکستان سے سخت ہمدردی ہے لیکن میں اس نئے ملک کی تعمیر میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا۔

Scanned by CamScanner

(جسے میر کہتے ہیں صاحبو!،ص:۸۳۸۔۸۳۹)

تقسیم کے بعد مسلمانوں میں جو لوگ ہندوستان میں رہ گئے وہ تمام مصایب اور مسایل کے باوجود ملک کی تعمیر نو میں منہمک ہو گئے۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اس وقت بھی ان کا اپنا علمی ادارہ تھا۔حالات نازک تھے۔خود کو مستحکم کرنا مشکل تھا۔فرقہ پرستی عروج پر تھی۔اردو پر ہندی کی برتری ثابت کرنے کی جبری کوششیں جاری تھیں۔پرانی قدریں اور روایات دم توڑ رہی تھیں۔اس صورتِ حال پر حبیب حق لکھتے ہیں:

> انگریزوں نے جو کچھ اٹھارہویں صدی میں پایا،کوشش یہ کی کہ اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ بچ کر رہ جائے۔بستی نظام الدین یوں ہی رہے۔سرائے یوسف بھی برقرار رہ جائے۔نیا نظام جو آزادی کے طبل جنگ بجاتا ہوا آیا تھا،وہ تو ان سارے پرانے طریقوں،قدیم انتظامات کو یکے بعد دیگرے نیست و نابود کرتا چلا جارہا تھا۔پرانی قدریں ملیامیٹ ہو رہی تھیں۔

(جسے میر کہتے ہیں صاحبو!،ص:۸۶۴)

آزادی کے بعد اردو کا حال برا ہوا۔نئی نسل انگریزی تعلیم پر گام زن ہوئی۔میر و غالب کے ساتھ ازرا پاؤنڈ اور ٹی۔ایس۔ایلیٹ جیسے جدید شعرا کی شاعری پر سر دھننے لگی۔سائنس کی تعلیم کا رجحان عام ہوا۔

ہندوستان کی طویل تاریخ اور صوفیانہ افکار سے یہ ناول مزین ہے۔ہندوستان میں حضرت علی یار شاہ،داتا گنج بخش،خواجہ معین الدین چشتی سنجری،خواجہ قطب الدین بختیار کاکی،شیخ جلال الدین تبریزی،بابا فرید الدین گنج شکر،حمید الدین ناگوری،خواجہ نظام الدین اولیا،شیخ بہاوالدین زکریا ملتانی،خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی،فرید الدین عطار،شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری،بندہ نواز گیسودراز،شاہ میراں جی شمس العشاق،شیخ بہاوالدین باجن وغیرہ صوفیانہ افکار کے مبلغین ہیں۔ناول میں ان حضرات سے متعلق مزید تفصیلات موجود ہیں۔بیس بائیس صفحات پر ہندوستان میں تصوف کی جڑوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔شروع میں کہا جا چکا ہے کہ یہ ناول مشرقی اور مغربی تہذیب کا بہترین امتزاج اور مرقع پیش کرتا ہے۔میر صفدر حسین علوی دونوں تہذیبوں کے بیچ کی کڑی ہیں۔ان کا تعلق پاکستان سے ہے۔امریکہ میں جب کافی عرصہ گزار کر اپنے وطن پاکستان گئے تو ان کی رائے بدل گئی۔ذیل کے اقتباس سے ذہنی کشمکش اور تہذیبی ٹکراؤ کا عکس دیکھا جا سکتا ہے:

> کراچی،میر صاحب نے محسوس کیا کہ ایک لوہے کا طوق ہے جو ان کی گردن میں پھنس کر رہ گیا ہے۔اتارے نہیں اترتا۔

(جسے میر کہتے ہیں صاحبو!،ص:۲۶۴)

اس ناول کا ایک بڑا حصہ امریکہ اور کچھ لندن کے کلچر کو پیش کرتا ہے۔ویسٹرن لائف اسٹائل،ویسٹرن میوزک،ریستوراں کلچر وغیرہ اس حصے کے تخلیقی دھاگے میں پروئے گئے ہیں۔روحی فخر الزماں کے وسیلے سے لسانی مباحث بھی آگئے

Scanned by CamScanner

ہیں۔روحی صاحبہ کو یہ علم ہوتا ہے کہ" وہ قدیم الفاظ جو اردو میں رائج ہیں اور جن کے متعلق عام خیال ہے کہ وہ عربی اور فارسی سے آئے ہیں، ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو قدیم تر زبانوں سے درآمد کیے گئے ہیں۔اور چلتے چلتے انھوں نے اپنی شکلیں بدل لی ہیں اور اپنے مطالب بھی۔ضرورت تھی کہ بابل اور نینوا کی زبانوں، کلدانی زبانوں، قدیم مصری اور قدیم تر ایرانی زبانوں کی ڈھونڈ ھائی کی جائے تا کہ ان کا منبع ڈھونڈ ھا جا سکے۔" (جسے میر کہتے ہیں صاحبو!، ص: ۹۳۳) روحی صاحبہ نے علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔پھر لسانیات سے دل چسپی کے نتیجے میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی آ گئیں۔ایک سالہ کورس کے بعد لسانیات میں ایم.اے.کی اجازت مل گئی۔ جے.این.یو. میں رہ کر اس کے مخصوص کلچر سے خود کو ہم آہنگ کیا۔کمیونزم سے قریب ہوتی گئیں۔یہیں سے انھوں نے پی.ایچ.ڈی.کی۔'بہار عجم' اور 'غیاث الغات' پر سنسکرت زبان کے الفاظ وقواعد کے اثرات پر مقالہ سپرد قلم کیا۔امریکہ جانے کے بعد میر صاحب سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئیں اور میر صاحب ان کے ساتھ جے.این.یو.اعزازی پروفیسر کی حیثیت سے آ گئے، مگر ان کا دل یہاں نہیں لگ پایا اور وہ دوبارہ امریکہ چلے گئے۔ وہیں ان کی موت ہوئی۔

ناول کی فضا کو نیچرل بنانا قطعی آسان نہیں۔اس کے لیے فن پر گہری نگاہ کی ضرورت ہے۔حبیب حق کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو اور انگریزی کے عمدہ ناولوں کا مطالعہ کیا ہے اور ناول کی شعریات سے کما حقہ واقف ہیں۔اس لیے انھوں نے عمدہ تکنیک کا استعمال کیا ہے۔طبیعت میں جولانی اور قلم میں روانی ہے۔ان کے ہاں فکری سطح پر انتشار کے بجائے تسلسل پایا جاتا ہے۔نہ صرف انھیں کرداروں کی نفسیات پر گرفت ہے بلکہ جذبات بھی فطری طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ 'جذبات' ناول کے لیے لازمی ہیں کیوں کہ واقعات میں جذبات سے کشمکش پیدا ہوتی ہے۔اسی کشمکش اور تصادم سے واقعات اور کردار ہمہ جہت بنتے ہیں اور قاری کی فکر پھڑکتی رہتی ہے۔جرمن ناول نگار گوئٹے کہتا ہے:

> "ناول میں 'جذبات' اور 'واقعات' پیش کیے جاتے ہیں۔ڈرامہ میں 'کردار' اور 'کارنامے' پیش کیے جاتے ہیں۔ناول آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے اور ہیرو کے جذبات، کسی نہ کسی ذریعے سے، مکمل چیز کے کھل کر سامنے آنے اور اختتام تک پہنچنے کے رجحان کو روکتے رہتے ہیں"۔(ترجمہ: جمیل جالبی)

جذبات نگاری نہایت مشکل فن ہے۔یہاں اچھے اچھوں کا ہاتھ کانپنے لگتا ہے۔قلم لغزشیں کھاتا ہے لیکن حبیب حق نے ماہرانہ طریقے سے کرداروں کے جذبات کو سچویشن کے مطابق ابھارا ہے۔موصوف میں جزئیات اور عرق ریزی کی خوبی پائی جاتی ہے۔منظر نگاری بھی کافی احتیاط چاہتی ہے۔صورتِ حال کے موافق منظر دکھائے جائیں اور ان میں تخلیقی نمو پذیری موجود ہو تو واقعات و حالات میں دل چسپی برقرار رہتی ہے اور قاری خود کو فن پارے سے الگ محسوس نہیں کرتا۔اس کے احساسات متن میں جذب ہوتے جاتے ہیں۔وہ تخلیق کار کا ہم نوا بن جاتا ہے۔اس ناول میں ایسے مواقع بارہا آئے ہیں جہاں ناول نگار نے تخلیقی عمل میں شدتِ احساس سے کام لیا ہے اور تخلیقی جواہر لٹانے کے ساتھ گل بوٹے بھی کھلائے ہیں۔

Scanned by CamScanner

قرأت کے دوران تصنع کا احساس نہیں ہوتا:

رات تیکھی ہو چلی تھی۔ برسات کچھ دنوں پہلے ختم ہوئی تھی اور سردیوں کے آثار سے تھے۔ لیمپ کی قندیل آنکھوں کو ٹھنڈی ٹھنڈی سی لگنے لگی تھی۔ درختوں کی شاخیں گہرے سبز پتوں سے لدی لدائی تھیں اور ایک آدھ کے پتے آہستہ آہستہ ٹوٹ کر زمین پر ایک چادر سی بچھانے کے جتن میں لگے ہوئے تھے۔ کبھی کبھی شمال سے لپک کر آتی ہوئی ہواؤں کی ایک لہر اس چادر کو زیروزبر کر دیتی تھی۔ درختوں سے الوؤں کی چیخنے کی ایک آدھ آوازیں سنائی دے جارہی تھیں جیسے کہ کوئی کسی سے ڈپٹ کر کچھ کہنا چاہتا ہو، پر اس کی آواز گلے میں پھنس کر ایک نالۂ دردی بن کر رہ جائے۔ سازندوں نے ساز بجانے روک دیے تھے۔ وہ بھی تھک گئے تھے۔

(جسے میر کہتے ہیں صاحبو!،ص:۶۳۵)

بارش باہر رک گئی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوائیں نیویارک کی اونچی اونچی عمارتوں سے سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ آسمان صاف سا ہو چلا تھا۔ پر نیویارک میں نشہ آوروں کے علاوہ آسمانوں کی جانب دیکھتا بھی کون ہے۔

(جسے میر کہتے ہیں صاحبو!،ص:۹۰۷)

تخلیقی عمل میں جذبات کی شدت اور صداقت نے ماورائیت اور فکری افق کے ملے جلے اثرات نمودار ہوتے ہیں۔ فن پارے کی عظمت اس امر میں ہے کہ تخلیقی بہاو فطری بہاو میں تبدیل ہو جائے اور جذبات کی آنچ حرارت پہنچائے۔ ذہن کو گرمائے۔ روح کو تڑپائے۔ بصیرت کے ساتھ ساتھ حظ بھی عطا کرے اور اس میں جمالیاتی ہم آہنگی بھی ہو۔ کیفیات نامیاتی ہوتی ہیں۔ کبھی سکوت کی متقاضی ہوتی ہیں اور کبھی کہرام مچا کر دم لیتی ہیں۔ محسوسات کو زبان عطا کرنا کارِ محال ہے۔ فن پر قدرت اگر نہ ہو تو فن کار منہ کی کھائے گا۔ حبیب حق حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کی تحریر میں جذبے کی صداقت اور روحانی کیف کے آثار جابجا نظر آتے ہیں:

ان کی محبت ایک طور سے تشنہ رہی۔ شاید ساری محبتیں یوں ہی تشنہ کام رہ جاتی ہیں۔ شاید ایک ہی محبت ہمیشہ قایم و دایم رہتی ہے۔ وہ محبت جسے صوفی فنا ہو جانا کہتے ہیں یعنی ذات بے ہمتا میں فنا ہو جانا ،اس کی محبت میں غرق ہو جانا، پتہ نہیں اس میں کتنی سچائی ہے...... سچائی تو شاید لارڈ کیلومین کے بقول ناپنے اور اشیا کو احاطہ کرنے کی بدولت آتی ہے۔ غیر مرئی اشیا میں ہم سچائی کیوں ڈھونڈتے ہیں۔ وہ تو سچائی کے ڈھانچے سے ایک الگ سی چیز ہوتی ہے...... لیکن پتہ نہیں اس سچائی میں کتنی سچائی ہے۔

(جسے میر کہتے ہیں صاحبو!،ص:۳۷۵۔۳۷۶)

حبیب حق کو نسائی جذبات کے اظہار میں بھی دشواری نہیں ہوتی۔ نہایت خوبی سے نسائی کیفیات کو انھوں نے

Scanned by CamScanner

گرفت میں لایا ہے۔ تارہ، فرخندہ، روحی، شیریل، جل، میری جو، جولیا، جہاں آرا بیگم، سوشیلا، اختر النسا جیسے کرداروں کے محسوسات کو سادگی و پرکاری کے معیار پر پیش کیا ہے۔ جنسی معاملات کو بھی بڑی خوبی سے طے کیا ہے۔ ان کے یہاں جنسی عمل، بدن اور روح کے ملاپ یا سنگم کا نام ہے۔ ان کی جنسی جزئیات نگاری قابل توجہ ہے۔ پورے ناول میں مادیت اور صارفیت پر روحانیت غالب ہے۔ فکر کے ساتھ قلم بھی آزاد ہے۔ محذوفات پر جرأتِ اظہار حاوی ہے۔ اظہاریے میں کسی طرح کی رکاوٹ یا بہت زیادہ جھول کا احساس نہیں ہوتا۔ اس ناول پر اعتراض کا جو سب سے نمایاں پہلو ہے وہ زبان کا استعمال ہے۔ جمع الجمع کی صورت (علماؤں، اساتذوں، الفاظوں وغیرہ) ناگوار گزرتی ہے۔ پروف کی جا بجا غلطیاں ذہن کو مکدر کر دیتی ہیں۔ اس باب میں ہمارا خیال یہ ہے کہ ان تسامحات سے ناول کی عمدگی پر حرف نہیں آتا اور نہ ہی ترسیل کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ہم شمس الرحمٰن فاروقی کے ہم خیال ہیں کہ "غلطی عیب نہیں ہے۔" ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی اردو ناول کی تاریخ میں نہایت مبارک واقع ہوئی ہے۔ اس دہائی نے اردو ادب کو دو اہم ناول دیے 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' (شمس الرحمٰن فاروقی) اور 'جسے میر کہتے ہیں صاحبو!' (حبیب حق)۔ دونوں ناول بیسویں صدی کی ہمہ گیر گنگا جمنی تہذیب، تاریخی حقایق کی بازیافت اور سیاسی جبر و بحران پر مبنی ہیں۔ انھیں اس صدی کا رزمیہ و بزمیہ منظر نامہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ بعض لوگوں کو ان میں بکھراو اور تصنع کا احساس ہو سکتا ہے لیکن کیا کیا جائے۔ یہ عناصر اس تہذیب کا اٹوٹ حصہ ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ ادبی تاریخ اس ناول کو فراموش نہیں کرے گی کیوں کہ نہ صرف یہ اپنے مندرجات کی وجہ سے منفرد ہے بلکہ اسلوب و اظہار کی سطح پر بھی متوجہ کرتا ہے اور سنجیدہ قارئین کی میزان پر باوزن اور باوقار ہے۔

❀❀❀

Scanned by CamScanner

رونق افروز

بھیونڈی کے شعری افق پر تابندہ مہر و ماہ

ہندوستان کا مانچسٹر کہا جانے والا شہر بھیونڈی نہ صرف اپنی صنعتِ پارچہ بافی کے لیے مشہور ہے بلکہ شعر و ادب کے حوالے سے بھی اپنا ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ دس لاکھ آبادی پر مشتمل اس شہر میں تقریباً دس لاکھ پاورلومس ہیں، کثیر تعداد میں اسکول، کالج اور ادبی تنظیمیں ہیں۔ اس شہر میں موجود ادبا و شعرا اور ہونے والی ادبی، علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کے پیشِ نظر اسے اگر شہرِ ادب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ بھیونڈی کے شعری افق پر یوں تو بے شمار شعرا اپنی اپنی کرنوں کے جلوے بکھیر رہے ہیں طوالت کے خوف سے ان تمام کا ذکر از بس مشکل ہے البتہ چند ایسے شعرا کا ذکر ناگزیر ہے جنھوں نے اپنی ایک شناخت بنائی۔ جن میں سے چند کا اجمالی تعارف پیش ہے۔

محترم ابوبکر' جناب' ایک جہاں دیدہ انسان، ایک سبک دوش معلم اور کہنہ مشق شاعر ہیں جن کا ماضی انتہائی روشن رہا ہے۔ آپ کے دور میں شعر و شاعری اپنے عروج پر تھی۔ آپ کے ہم عصروں میں زیڈ. عابد، عبدالقیوم نازاںؔ، شبیر احمد راہی، انس الہ آبادی، محمد عمر شفق، اختر راشدی، قمر پرتاپ گڑھی اور عرشی جون پوری جیسے باکمال اور قادرالکلام شعرا تھے۔ ۸۸رسال کی عمر کے باوجود آپ انتہائی چاق و چوبند ہیں۔ آپ کی شاعری میں روایت کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ جناب جب مشاعروں میں غزل سرا ہوتے ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے ان کا ایک شعر پیش ہے۔

اپنے بندوں کی حفاظت جو ہو رب کو منظور   مکڑیاں تان دیا کرتی ہیں جالے کتنے

شاکر ادیبی ایک ریٹائرڈ ٹیچر، نیک دل انسان اور ایک اچھے شاعر ہیں۔ آپ کو ادبی، تعلیمی اور سماجی خدمات کے اعتراف میں کئی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ایک شعری مجموعہ 'حباب میں موتی' شائع ہو چکا ہے۔ آپ کا کلام ٹی.وی. اور آل

3rd Floor, Badar Manzil, Patel Nagar, V. P. Naka, Bhiwandi.

Scanned by CamScanner

انڈیا ریڈیو، ممبئی سے متواتر نشر بھی ہوتا رہتا ہے۔ پہلے ترنم میں غزل سرا ہوتے تھے، اب تحت میں پڑھتے ہیں۔

میری تشکیل میں، تعمیر میں ماں ٹوٹ گئی　　مجھ کو دکھ یہ ہے کہ بنیادِ مکاں ٹوٹ گئی

مومن جانِ عالم رہبؔر ایک اچھے شاعر، کامیاب و سبک دوش معلم اور منجھے ہوئے ادیب ہیں۔ موصوف نے تین مضامین میں ایم۔اے۔ کیا ہے۔ رہبر صاحب کا شمار شہر کے استاد شعرا میں ہوتا ہے سلسلۂ تلمذ عبدالقیوم نازاں سے ہوتا ہوا دبستانِ آرزو تک پہنچتا ہے۔ تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں اور ایک نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ اردو بال بھارتی (پونا) میں زبان کی نوک پلک سنوارنے سے لے کر اردو شعر و ادب کو ایک معیار بخشنے میں رہبر صاحب کا اہم رول رہا ہے۔ ایک شعری مجموعہ 'امتزاج' بھی شایع ہوا اور دوسرا مجموعہ 'انبساط' زیرِ طبع ہے۔

خواہش ہے کہ انسانوں کو دوں درسِ محبت　　یہ درد سری ہے تو مجھے درد سری دے

عبدالرحیم تاباںؔ صاحب ایک استاد شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے انسان بھی ہیں شعر و شاعری انھیں ورثے میں ملی ہے۔ ان کے والد بزرگوار عبدالاحد آفاقی صاحب شہر کے ایک معتبر شاعر تھے۔ تاباں صاحب کا سلسلۂ تلمذ بھی نازاں صاحب سے ہوتا ہوا دبستانِ آرزو تک پہنچتا ہے۔ آپ بزمِ نازاں کے روحِ رواں بھی ہیں اور ایک مدت سے ماہانہ طرحی نشستوں کا انعقاد بھی کرتے ہیں۔ آپ کے حلقۂ تلامذہ میں کئی اچھے شاعر پائے جاتے ہیں۔

خیرات بانٹتی ہے اجالوں کو تیرگی　　سورج کھڑا ہے ہاتھ میں کاسہ لیے ہوئے

دبستانِ ناسخ کے نمائندہ شاعر محسن امیدی برہان پوری اپنے جلو میں بے شمار ادبی کرنیں سمیٹے ہوئے ہیں۔ محسن صاحب روایتی شاعر ضرور ہیں لیکن ان کی فکر میں تازگی اور جدت کی آمیزش بھی ملتی ہے۔ محسن صاحب کئی مجموعہ ہائے کلام کے خالق بھی ہیں جن میں غزلوں کا مجموعہ 'سمتِ سفر' اور نعتوں کا مجموعہ 'نور سے نور تک' قابلِ ذکر ہیں۔

ہم کو آیا نہیں چہرے کی صفائی کا خیال　　بس پریشان رہے آئنہ دھوتے دھوتے

ایوب صابر ایک ذہین، سنجیدہ اور سلجھے ہوئے شخص کا نام ہے۔ بہ قول شمس الرحمٰن فاروقی ''ایوب صابر کے کلام سے ہر وہ شخص آشنا ہوگا جسے جدید ادب اور خاص کر اس ادب سے دل چسپی ہے جو ۱۹۶۰ء میں کم و بیش منظرِ عام پر آیا اور جس نے اگلی کئی دہائیوں کے تمام اردو ادب کی راہ متعین کی۔'' ایوب صابر کا پہلا مجموعۂ کلام 'ناؤ بھیگے کاغذ کی' شایع ہوا تو ان کی شخصیت اور نکھر گئی ورنہ کتنے شعرا ایسے ہیں کہ جن کا مجموعۂ کلام چھپنے کے بعد ان کی شعری شخصیت بکھر گئی ہے۔ ایوب صابر اپنے شعر ؎

جس پہ نہ دے سکا کوئی ہلکی سی دستکیں　　فکر و نظر کے میں وہی دروازے وا کروں

پر عمل پیرا ہیں۔ بھیونڈی کے شعر و ادب میں ایوب صابر کا ایک نمایاں مقام ہے جس کی شناخت ان کا یہ شعر ہے ؎

لوگ رکھتے ہیں چراغوں پہ نظر　　میں ہواؤں پہ نظر رکھتا ہوں

ریاض الدین ریاضؔ کا آبائی وطن الہ آباد ہے لیکن وہ عرصۂ دراز سے بھیونڈی کو ہی اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں۔

Scanned by CamScanner

ریاض انتہائی ذہین، سنجیدہ اور کم گو ہیں۔ اردو اور ہندی دونوں زبانوں پر عبور ہے۔ بزمِ عرشی کے روحِ رواں ہیں۔ کم کہتے ہیں لیکن سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ شعروں میں شعریت اور جامعیت کے ساتھ معنویت بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی فکر کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے۔

ذرا لہجہ بدل کر دیکھیے تو　　　بدل جاتے ہیں لفظوں کے معانی

رازؔ پرتاپ گڑھی بھی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں، بہ قلم رازؔ...... "ایک دیانت دار قلم کو جب اپنے بارے میں کچھ کہنے یا لکھنے کو کہا جائے تو تلخ سچائیاں ضمیر اور وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں...... بہرکیف میں کیا میری بساط کیا! راقم السطور نے متوسط گھرانے میں اس وقت آنکھیں کھولیں جب دنیا دوسری جنگِ عظیم کے بعد نشاۃ ثانیہ میں قدم رکھ رہی تھی اور اس وقت کے کرب ناک مناظر نے نہ جانے کتنوں کو مصنف اور کتنوں کو شاعر بنایا، تیسری دنیا کا یہ ذرۂ خاک بھی جب دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے انھیں لفظوں میں پرو کر دل کی آواز اور ضمیر کے احساس میں بولتا ہے۔" موصوف کا ایک مجموعۂ کلام 'شاخِ انا' ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ جس کا اجرا 'بزمِ مساوات' کی جانب سے بڑے پیمانے پر ہوا اور جس میں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں (ایک لاکھ گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے) کیسۂ زر بھی پیش کیا گیا۔

اس کی دکھتی رگ پہ انگلی اس لیے رکھی نہیں　　　شیشۂ دل ٹوٹ جانے کا بہت امکان تھا

معصوم انصاری ایک ایسے سنجیدہ اور معتبر شاعر کا نام ہے کہ جو اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں پر چلتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بھی اس کی پیروی کریں خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط۔ مشاعروں کی دنیا میں ان کا ایک خاص مقام ہے ایک وقت وہ تھا جب وہ مشاعروں میں غزل سرا ہوتے تھے تو سامعین عش عش کر اٹھتے تھے معصوم کی شاعری میں کربِ ذات بھی ہے اور زمانے کا گلہ بھی۔ 'رگِ دریا' پہلا شعری مجموعہ ہے۔ دوسرا شعری مجموعہ زیرِ ترتیب ہے ان دنوں وہ اپنے ہی درج ذیل شعر کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔

حالات کے حصار سے نکلوں میں کس طرح　　　موقع یہ سوچنے کا غزل نے نہیں دیا

عزیز نبیل اپنے نام کی طرح اپنی فکر میں بھی جدت رکھتے ہیں۔ ان کا شمار ملک و بیرون ملک کے ان ذہین شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی صلاحیت اور محنت کی بدولت ادب میں ایک نمایاں مقام بنالیا ہے۔ یوں تو ان کا تعلق الہ آباد سے ہے لیکن انھوں نے بھیونڈی کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا ہے ان دنوں نبیل دوحہ قطر میں ہیں اور مشقِ سخن جاری ہے۔ عزیز نبیل کے اشعار میں عصری آگہی کے علاوہ زمانۂ ماضی اور حال کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔ عزیز نبیل کا پہلا مجموعۂ کلام 'خواب سمندر' شائع ہوچکا ہے اور اہلِ نظر سے داد پاچکا ہے۔

کھینچ لیتے ہیں ہواؤں کی رگوں سے پانی　　　جب کبھی وادیِ بے آب میں کھو جاتے ہیں

عین الدین عازم ایک محنت کش، بے باک اور تیکھے لہجے کے شاعر ہیں اور 'شہرِ ادب' کے ابھرتے ہوئے شعرا میں اپنا ایک الگ مقام رکھتے ہیں۔ عازم کی شاعری سماج کے ٹھکرائے ہوئے کسی فرد کی داستان لگتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ خود بھی شعری کردار کا کوئی حصہ ہوں۔ بذلہ سنجی، لہجے کی کاٹ اور بات سے بات پیدا کرنا ان کی فطرت خاصہ ہے۔ غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

قبائے گل کو محافظ نہ جان خوشبو کا   لباس جسم چھپاتا ہے آبرو تو نہیں

ندیم فاضلی کا تعلق برہان پور سے ہے جہاں کی مٹی میں بھی بوئے سخن پائی جاتی ہے۔ وہ ایک کم گو لیکن انتہائی سنجیدہ شاعر ہیں۔ شعر کہتے ہیں تو فکر کی گہرائیوں میں ڈوب کر، شعر پڑھتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے ان پر الہام ہو رہا ہو۔ شعر بہ غور سنتے ہیں، داد سوچ سمجھ کر دیتے ہیں۔ ان کے اشعار میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔

ابھی تو مٹی مہک اٹھی ہے نمی کو پا کر   ابھی وہ پانی کی چال سے آشنا نہیں ہے

شکیل احمد شکیل اسم با مسمیٰ ہیں۔ نئی امنگوں کی ترجمانی اور حالاتِ حاضرہ کی غمازی کرنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ شکیل کے ہاں ایک استحکام اور روایت کی پاس داری ملتی ہے۔ تحت اللفظ میں پڑھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ ناظمِ مشاعرہ بھی ہیں۔ دورانِ نظامت ان کی بے باکی اور لہجے کی کاٹ دیدنی ہوتی ہے۔ محمد عمر شفق کے لائق و فائق شاگرد نے اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چل کر ان کا نام روشن کر رکھا ہے۔

جہاں ہم ایک دوجے کی ضرورت بن رہے تھے   الگ ہم کو اسی دوران ہونا چاہیے تھا

امیر حمزہ ثاقب ایک نئی سوچ رکھنے والے شاعر، بہترین نثر نگار اور ایک فعال معلم ہیں۔ جی۔ایم۔ مومن ویمنز کالج میں بہ طور اسسٹنٹ پروفیسر تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ طلبہ کی ذہنی و فکری تربیت کے لیے انھوں نے ایک ادبی تنظیم 'ہم آہنگ رائٹرس فورم' بھی قایم کر رکھی ہے جس کے بینر تلے آئے دن نئے نئے پروگرامس ترتیب دیتے رہتے ہیں اور اس میں نو آموز قلم کاروں کو اپنی صلاحیت اجاگر کرنے کا موقع بھی فراہم کرتے ہیں۔ ان دنوں 'ادبی کارواں' نامی رسالہ ترتیب دینے میں مصروف ہیں۔

آمد کے اشعار قلم زد کرتا ہوں   کیسا پاگل ہوں خود کو رد کرتا ہوں

اختر جمال کا شمار ان ممتاز شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی تازہ کاری اور لہجے کی انفرادیت کی بدولت بہت کم وقفے میں زیادہ سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ کربِ ذات کا اظہار اور عصری حسیت ان کی فکر کا محور ہیں لیکن اپنی غیر مستقل مزاجی اور بے توجہی کی وجہ سے شعروادب میں وہ مقام حاصل نہ کر سکے جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر وہ مسلسل شعروادب سے جڑے رہتے تو آج ان کا ایک اہم مقام ہوتا۔ ان دنوں وہ اپنا شعری مجموعہ ترتیب دے رہے ہیں۔

آنکھ والو اپنی آنکھوں کو زمیں پر گاڑ لو   میں نے سورج کی طرف دیکھا تھا اندھا ہو گیا

عبدالوہاب قمر کم ضرور کہتے ہیں لیکن جو بھی کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر اور فکر کی گہرائیوں میں ڈوب کر کہتے ہیں اس لیے ان کے شعروں میں کربِ ذات کا اظہار اور دردِ دل کی کسک ملتی ہے۔ جب وہ غزل سناتے ہیں تو سامعین جھوم جھوم جاتے ہیں۔ ان کا نکھرا ہوا رنگ ملاحظہ فرمائیں۔

اسی خیال سے سب کچھ لٹا دیا اس پر   نہ جانے کون سی شئے اس کو بھانے والی ہے

❀❀❀❀

Scanned by CamScanner

ذکیہ مشہدی

فضلو بابا ٹخ ٹخ

صدیوں پہلے کی بات ہے..... یا کم از کم ایسا لگتا ہے کہ بچپن گزرے صدیاں بیت گئیں..... تب میں اپنے بزرگوں کی گود میں گھس کر کہانیاں سنا کرتی تھی۔ والد کے پرانے دوست اور کلاس فیلو شمسی چچا، پرنسپل طبیہ کالج لکھنؤ (اب مرحوم ومغفور) ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں ان کے سر پر سوار ہوگئی۔ "چچا، کہانی"

والد اپنی روداد سنانے میں مشغول تھے، جھنجلا کر بولے۔ "دفع ہو شیطان کی خالہ! ہر وقت کہانی....."

شمسی چچا ہنسنے لگے بولے: "تمھاری بیٹی ہے، بات منوائے بغیر ٹلے گی نہیں۔ اس کی فرمائش پوری کر دیتا ہوں، پھر اطمینان سے گپ ہوگی۔"

میں ان کی لانبی چوڑی گود میں باقاعدہ پھیل کر بیٹھ گئی۔

"سنو، ایک پہلوان تھا۔ نام امیرو خاں طمیر وخاں، لنگڑ چمرِ چا خاخاں، چی وئی وئی۔ اب اگر تم اس نام کو دہرا دو تب تو کہانی آگے سناؤں گا، ورنہ تم فیل اور کہانی ختم۔"

میں نے جلدی جلدی ہانپتے کانپتے دہرایا: "امیرو خاں طمیر وخاں، لنگڑ چمرِ چا خاخاں، چی وئی وئی۔"

"واقعی شیطان کی خالہ ہے!" وہ زور سے ہنسے۔ گودی میں بھونچال آ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں فضلو بابا ٹخ ٹخ کے اِکے میں بیٹھ کر شرافت چچا کے گاؤں جا رہی ہوں اور اِکہ اُلار ہو گیا ہے۔

"اچھا بھئی چلو، ہم شرط ہار گئے۔ اب آگے کی کہانی سناتے ہیں۔"

"ایک بہت بڑا میدان تھا، ہرا بھرا اور شاداب۔ اس کے بیچوں بیچ ایک ہزار میل چوڑی ندی بہتی تھی۔ ندی کا

F- 1. Grand Pallavi. Judges Court Road. Patna- 800 004 (Bihar).

Scanned by CamScanner

پانی شفاف تھا۔ اس میں بہت سی مچھلیاں تھیں۔ کنارے اُگے درختوں میں رنگ برنگی چڑیاں رہا کرتی تھیں۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے جانور ٹہلتے پھرتے تھے۔ اس ندی کے کنارے وہ رہا کرتا تھا، ارے وہی...... امیر وخاں طمیر وخاں...... غلاموں کی بہت بڑی فوج اس کے پاس تھی۔ ندی کے دوسرے کنارے پر ایک اور پہلوان رہا کرتا تھا۔ اس کا نام تھا آلتو خاں فالتو خاں چڑاتے خاں مارتے خاں دونالی خاں بے دھڑک...... ''' بے دھڑک' انھوں نے زور دے کر ادا کیا۔

میں نے قدرے سہم کر ابا کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر بے زاری کے آثار تھے۔ کہانی جاری تھی۔

''امیر وخاں طمیر وخاں رات کو اپنی روٹی خود پکاتا تھا۔ جب وہ ہاتھوں پر روٹی بڑھاتا تو اس کی تھاپ ایک ہزار میل چوڑی ندی کے پانیوں سے گزر کر آلتو خاں فالتو خاں کے گھر پہنچتی تو اطراف میں بسے لوگوں کے دل دہل جاتے۔ پیڑوں پر بسیرا کرتی چڑیاں بے چین ہو کر اڑنے لگتیں اور شیر اپنی ماندوں میں دبک کر بیٹھ جاتے۔''

''پھر؟'' میں نے حیرت سے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

''پھر اس کے جواب میں آلتو خاں فالتو خاں اپنی رانوں پر ہاتھ مارتا اور دوسرے بھرے پیٹ پر پھیر کر ڈکار لیتا...... غاؤں...... اوٗں...... اوں...... اس کی رانیں پیٹنے اور ڈکار لینے کی آواز ایک میل چوڑی ندی کے پانیوں سے گزر کر دوسرے کنارے پہنچتی اور راستے میں ملنے والے سارے پنکھ پکھیرو، آدمی جانور بے چین ہو جاتے۔ کئی سالوں سے یہی ہوتا چلا آ رہا تھا۔

''یہ دونوں کشتی لڑ کر خود فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟' گاؤں کے کچھ نیک بزرگوں، پنکھ پکھیروؤں اور چھوٹے چھوٹے جانوروں نے کہا۔'' ہمارے دل کیوں دہلاتے رہتے ہیں؟''

''جب جی چاہتا ہے اپنے غلاموں کو بھیج کر ہمیں پکڑوا لیتے ہیں۔'' ایک سفید بالوں والے خرگوش نے کہا۔

''ہمارے گھاس کے میدانوں میں آگ لگا کر اپنی روٹیوں کے لیے گیہوں اُگاتے ہیں۔'' ہرن کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

بزرگوں نے تاسف سے سر ہلایا۔'' ہم سمجھا بجھا کر ہار گئے، ہمارا ان پر کوئی زور نہیں۔''

اور شاید حالات پر بھی کسی کا زور نہیں ہوتا۔ اسی وقت چچا زوار حسین نازل ہو گئے اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ ضرور مارتے خاں بے دھڑک ان ہی کی صورت کا رہا ہوگا۔ ابا اور شمسی چچا ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں شدید کوفت کے ساتھ اندر سنک گئی، کہیں چچا زوار حسین رانوں پر ہاتھ مار کر پیک کے چھینٹے اڑا کر پھر اپنا وہی پرانا قصہ نہ شروع کر دیں جس سے ایڑی میں لگتی اور چوٹی میں بجھتی۔

''اری بٹیا، تو پھر نقل کر کے کلاس میں فرسٹ آ گئی؟''

اس وقت کہانی میں ایسا اڑنگا لگا کہ کہانی ادھوری رہی تو رہ گئی کیوں کہ شمسی چچا دوسرے دن واپس لکھنؤ چلے گئے

Scanned by CamScanner

تھے۔ میں نے اپنی ٹیڑھی کبڑی تحریر میں انھیں خط لکھا کہ وہ کہانی پوری کر دیں۔

''کہانی کہیں خط میں لکھی جاتی ہے بے وقوف! کہانی تو آس پاس گھومتی رہتی ہے۔اسے پکڑوں تو سناؤں۔''

انھوں نے جواب دیا۔

بعض واقعات کہیں گہری کسک چھوڑ جاتے ہیں، جیسے اس کہانی کا ادھورا پن، جو آج بھی پھانس بن کر دماغ میں گڑا ہوا ہے۔اور اب...... اب جب کہ میں خود آس پاس گھومتی کہانیوں کو پکڑ پکڑ کر دوسروں کو سناتی رہتی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ اس کہانی کو بھی خود ہی مکمل کر کے آپ کو سنا دوں تاکہ میرے اندر کی جو ننھی بچی چھپی بیٹھی ہے وہ مجھے تنگ کرنا چھوڑ دے۔

بچی ابھی شرافت چچا کے بھیجے ہوئے گنے چوسنے میں مصروف ہے۔

''فضلو...... اے فضلو...... ہمیں ایک چکر دلا کر لاؤ۔'' گنا ختم کر کے وہ فضلو بابا کی آستین پکڑ کر اچھلنے لگتی ہے جو گھوڑے کی لگام پکڑے اس کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ارے بٹیا سوجھے (سیدھی طرح) بیٹھو۔ابھی جائے کو ہے پانچوں پیرن۔ڈاکٹر تارا چرن کی ماتا جی منت مانے رہیں۔سو جات ہیں چدّر لے کے۔''

''ہم بھی چلیں فضلو بابا؟''

''پانچ مونگی مونگی مہرارو ہیں سب جوڑ کے۔تم کہاں بیٹھیو بٹیا؟'' وہ اکے سے شکر قند کی ٹوکری اُتارتے ہیں جو گنوں کی پھاندی کے ساتھ آئی تھی۔'' ہے لیو،کھاؤ بھونج بھونج کے۔سرلہمت کے کھیت کی گنجی (شکر قند) بڑی میٹھ ہوت ہے۔'' وہ دوبارہ اکے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ......

''فضلو بابا ٹخ ٹخ...... فضلو بابا ٹخ ٹخ!'' محلے کے دو چار لڑکے تالیاں بجاتے یکے کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ان میں موٹا بے وقوف پریم چند لوہیا سب سے آگے ہے۔پیچھے سے اسماعیل، جو اسماعیل پگلا کہلاتا ہے،اسے ٹھوکا دے رہا ہے۔

''اچھا بچو......'' فضلو بابا پریم چند کی طرف مصنوعی غصے سے چابک لہراتے ہیں۔''اب کے جیہو سگرا کے میلہ!''

پریم چند کھسیانا ہو کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔شہر سے پانچ میل دور سگرا کا میلہ لگا کرتا تھا۔لوہیا کنبے سے فضلو کا پرانا ربط ضبط تھا، اس لیے ان کا اِکہ پہلے سے ان لوگوں کے لیے بک رہا کرتا تھا۔اس وقت اس چھوٹے سے شہر سلطان پور اودھ میں لوگ باگ چار پانچ کوس کے لیے اِکہ تانگہ ہی استعمال کیا کرتے تھے۔فضلو کی گھوڑی ہمیشہ صحت مند اور چاق و چوبند رہتی تھی اور اِکہ درست،اس لیے ان کی سواریوں کا حلقہ شہر کے خواص پر مشتمل تھا۔

''ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ......'' اسماعیل کو سگرا کے میلے سے کوئی خاص دل چسپی نہیں ہے اس لیے وہ چڑائے جا رہا ہے۔

''فضلو بابا ٹخ ٹخ......''

Scanned by CamScanner

''اس کم بخت فضلو کو ٹخ ٹخ کا مینگنیا ہے۔(تائی اماں Mania کو مینگنیا کہا کرتی تھیں) کوس بھر بھی چلو تو ٹخ ٹخ سنتے سنتے دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کب سواری سے بات کر رہا ہے، کب رام پیاری سے، یہ سمجھنا بھی اکثر مشکل ہی ہوتا ہے۔''

''بڑی اماں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''طبیعت کم بخت کیا ٹھیک رہے گی۔اس بلڈ پریشر کا ستیاناس ہو، لگتا ہے لے ڈوبے گا۔'' تائی اماں پردے کے پیچھے سے تفصیل بتانے لگتی ہیں کہ جانا ضروری تھا ورنہ گھر سے نہ نکلتیں۔''اس وقت بھی سر بھاری ہو رہا ہے۔''

''کا ہو، آج سیر سے سیر گھاس نا ہیں کھائے رہیو کا ٹھیک سے؟''

''ارے کم بخت فضلو، میں گھاس کھاتی ہوں؟ ستیاناسی، تیرا ابیل کا منہ ہو!'' تائی اماں غصے سے اکھڑ جاتیں۔

''ہم تو رام پیاری کو کہت رہیں بڑی اماں'' فضلو بغیر شرمندہ ہوئے آرام سے جواب دیتے ہیں اور یکا یک اکہ روک کر اتر جاتے ہیں۔

''ستیاناس! اب کیا ہوا؟ اس رام پیاری کی ٹانگ ٹوٹ گئی کیا؟''

''دیکھو بڑی اماں، رام پیاری کو کچھو نا کہو۔ ہم کا گریالنیو جتنا من ہوے۔''

''ارے مردود، میں کیا گالیاں بکتی ہوں جو تجھے گالیاں دوں گی؟ اور یہ تیری گھوڑی آسمان سے اتری ہے کیا جو اسے کچھ نہ کہوں؟ ایسے چل رہی ہے جیسے آدھی مر گئی ہو۔''

''اکہ چلاتے چلاتے اس کی شکل خود گھوڑی جیسی ہوتی جا رہی ہے۔'' ایک بار کسی بات پر فضلو نے تھوتھنی جیسا منہ لٹکایا تو کم سخن اماں بھی بول پڑی تھیں۔اس وقت تائی اماں کی سرزنش پر اس نے پھر ویسا ہی منہ بنایا۔ رام پیاری کے لیے تحقیر آمیز الفاظ اس کی برداشت سے قطعی باہر تھے۔

''رام کھلاون کا کا سے لیے رہیں۔ کہے لگیں کہ بٹیا کا بیاہ نہ کرے کو ہوتا تو نہ بیچتیں۔کھول کر دیے لگیں تو آنکھ ماں آنسو۔ بولیں کہ بیٹا پھجلو، تو تو ای کا نام بدل دیہو۔ تمھار کا کا بڑے پریم سے و کھے رہیں۔ رام پیاری، ہمری پہلوٹھی کی بٹیا کوئی دو مہینا کی ہوئے کے گجر گئی رہی۔ او ہو کا نام رہا رام پیاری۔ تو بڑی اماں، ہم کہیں کہ ہم نام کاہے بدلیں گے؟ کون جرورت ہے نام بدلے کی؟ نام تو بڑا نیک ہے۔''

''وو ئی تمھاری یہ داستان کبھی ختم ہو گی۔ نوسو ویں بار دہرا رہے ہو۔ ذرا دو چار چابک رسید کرو اپنی اس نو پھول راج کماری کو تاکہ ذرا تیز چلے۔''

''کچھو ناراج ہیں کا؟'' فضلو کا لہجہ ریشم کی طرح نرم تھا۔

''نہیں، میں ناراض نہیں ہوں مگر......'' بڑی اماں پگھل گئیں۔

Scanned by CamScanner

''آپ کا نا ہیں کہت رہے بڑی اماں، رام پیاری سے پوچھت رہیں۔ پانچ ٹھو روپیہ دیجیے گا؟''

خون تائی اماں کی کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ مارے غصے کے خاموش ہو گئیں۔ ویسے بھی فضلو کی اودھی ان کے پلے پوری طرح پڑتی نہیں تھی۔ وہ مراد آباد کی تھیں۔ ''بڑی اماں پانچ ٹھو روپیہ نا دیہیں؟ کون بڑی بات ہے آپ کے لیے؟''

''ارے مجھ سے کہہ رہا ہے جنم جلے؟ مجھے کیا پتا کہ مجھ سے مانگ رہا تھا یا وہ بھی اس گھوڑی سے ہی کہہ رہا تھا۔''

''آپ سے کہت رہیں بڑی اماں،'' نہایت ملائمیت اور سادگی سے فضلو نے جواب دیا۔

''کیا کروگے پانچ روپے؟''

اس زمانے میں پانچ روپے ایک غریب آدمی کے لیے اچھی خاصی رقم تھی۔

''ابھی تو ہم تین گا ہکی لوگن سے پانچ پانچ روپیہ......''

''ایک اور شادی کر رہا ہے کیا؟''

''ہاہاہا......'' فضلو دوسری شادی کے مذاق پر جی کھول کر ہنسے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ دیوالی آرہی تھی اور لڑکے پٹاخوں کی ضد کر رہے تھے۔ لائی، بتاشے، تو کئی ججمان دیتے ہیں لیکن پٹاخوں کے لیے تو پیسہ چاہیے۔

''اچھا لے لینا پیسہ، چھڑا لینا پٹاخے، مگر کل ذرا ایک بجے ضرور چلے آنا۔ شرافت کے گاؤں جانا ہے۔ سب لوگ چلیں گے۔''

فضلو سے تائی اماں کی چخ ہمیشہ چلتی رہی لیکن پھر بھی کہیں جانا ہوتو انھیں کو بلاتیں۔ بقول تائی اماں، جب کہیں جانا ہوتو ڈھینگ کے ڈھینگ لڑکوں کی خوشامد کرو کہ اے بیٹا، ذرا فلاں جگہ ساتھ چلے چلو۔ پھر بھی دسیوں بہانے گڑھیں گے، ہزار نخرے دکھائیں گے۔ کبھی راضی ہوں گے، کبھی اس کے باوجود نہیں ہوں گے۔ فضلو سے کہلا دیا، وہ آگیا وقت سے۔ اب کسی سپہ سالار کی ضرورت نہیں کہ ساتھ چلے۔ اطمینان سے دور نزدیک، جہاں چاہو جاؤ۔ ڈاکٹر کے یہاں گھنٹوں کھڑا رکھ لو۔ یہ رشتہ اس وقت بھی قائم رہا جب رام پیاری مر گئی اور فضلو بابا رکشہ چلانے لگے۔ ان کے اکے کی طرح ان کا رکشہ بھی کبھی اسٹینڈ پر جا کر نہیں لگا۔ وہ محلے کے 'لگے ہوئے گاہکوں' کے یہاں کام کرتے تھے۔ رکشے میں آگے لکڑی کی بنچ لگا کر اب وہ ان لگے ہوئے گھروں کے بچوں کو اسکول بھی لے جانے لگے تھے۔ ہاں، یہ اسکول والا کام پکڑنے کی وجہ سے کبھی کبھی تائی اماں کو دقت ہو جایا کرتی تھی۔ پچھلی مرتبہ انھیں ظہر کے بعد بلایا تھا، وہ عصر بعد ہانپتے کانپتے وارد ہوئے تو تائی اماں کا بلڈ پریشر کافی بڑھ چکا تھا۔ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ گئیں۔

''ارے بڑی اماں، ہمری او سنیو کی ناہیں۔ بولت جات ہیں بولت جات ہیں۔'' وہ قدرے جھنجھلا کر بولے۔ پھر انھوں نے داستان سنائی کہ ان کے رکشے پر شہر میں نئے آئے ہوئے سول انجینئر اجے کمار کی بچی بھی اسکول جاتی تھی۔ وہ اس کے گھر پہنچے تو دیکھا، گھر میں تالا۔ اس کی نوجوان ماں پڑوس میں کہیں جا بیٹھی تھیں اور دھیان سے اتر گیا تھا کہ سنیچر کو ہاف

Scanned by CamScanner

ڈے کی وجہ سے بچی تو بارہ بجے ہی گھر آ جائے گی۔ فضلو کھونٹے کی طرح وہاں جم کر بیٹھ گئے، گر چہ باہر لان اور چھوٹا سا باغیچہ تھا اور ملازم سوکھے پتے صاف کر رہا تھا۔ بچی کی ماں واپس آئیں تو بچی کو انھیں سونپ کر ہی فضلو اٹھے اور باقی بچوں کو ان کے گھر پہنچایا۔ چلتے وقت اجے کمار کی بیوی کو لمبا لیکچر بھی پلایا کہ اس طرح گھر سے غایب نہ ہو جایا کریں، ملازم پر بچی کو نہ چھوڑیں، اسکول کے نظام الاوقات اچھی طرح یاد کر لیں، وغیرہ وغیرہ۔ زیادہ بوڑھے ہونے کے بعد فضلو بابا اور تائی اماں، دونوں میں اور بھی بے میل خواص پیدا ہو گئے تھے۔ تائی اماں بے صبر اور چڑچڑی ہو گئی تھیں اور فضلو سست رفتار، موڈی اور بکی۔ اس دن تائی اماں خوب ہی تو ناراض ہوئیں۔ مارے غصے کے اپنا پروگرام ہی کینسل کر دیا۔

پھر رام پیاری کی طرح ایک دن وہ بھی فضلو بابا کی زندگی سے خارج ہو گئیں۔

تیجے کے دن سب نے کھانا کھایا، لیکن فضلو اپنے برتن سرکا کر یوں ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچی زمین پر ان کے آنسوؤں کا گول نشان دیر تک گیلا رہا۔

پھر فضلو بابا کے شانے اور بھی ڈھلک گئے اور قویٰ کمزور ہو گئے۔ اب ان سے رکشہ بھی نہیں چلتا تھا۔ وہ بازار میں ترکاری کا ٹھیلا لگانے لگے تھے۔ گردن جھکائے چپ چاپ سبزیاں تولتے رہتے۔ ایک بیٹا تھا جو کب کا بمبئی بھاگ چکا تھا۔ سنا، وہاں درزی کا کام کرتا تھا۔ تین بیٹیاں تھیں، تینوں کے بیاہ ہو چکے تھے۔ بیوی کب کی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ایک اکیلا پیٹ پالنے میں ایسی دقت نہ ہوتی لیکن کچھ عرصے پہلے ایک داماد ان کی بیٹی کو مار پیٹ کر ان کے گھر چھوڑ گیا۔ اب اس کا پیٹ تو پالنا ہی تھا۔ بیٹی بیڑیاں بناتی تھی، پھر بھی انتہائی عسرت میں بسر ہو رہی تھی۔ وہ اکثر سبزی تولتے تولتے ہاتھ روک کر خلا میں تکنے لگتے اور دھیرے دھیرے بُدبُداتے۔ ''ٹخ ٹخ ٹخ ٹخ، سنبھل کے بٹیا رام پیاری، سنبھل کے!'' شاید وہ اس عہدِ زریں میں واپس لوٹ جانا چاہتے تھے جب ان کے قویٰ مضبوط تھے، ان کے بال بچے ان کے سایے میں محفوظ تھے اور رام پیاری ایک ماں بن کر ان کی کفالت کر رہی تھی۔

یا وہ محض سٹھیا گئے تھے؟

لیکن مجھے کیا ہو گیا؟ میں تو فضلو بابا جتنی بوڑھی نہیں ہوں۔ نہ میرے بال سفید ہوئے ہیں، نہ دانت ٹوٹے ہیں اور نہ ہی میری مت ماری گئی ہے۔ میں تو امیرو خاں ظمیرو خاں اور مارتے خان بے دھڑک کی کہانی سنانے جا رہی تھی جو خوف و دہشت پیدا کرتے اور قبروں پر اپنا راج سنگھاسن جماتے ہیں۔ یہ فضلو بابا کہاں سے درمیان میں آ گئے؟ میں بھی سٹھیا گئی ہوں کیا؟

بات دراصل یہ ہے کہ مجھے عادت ہے ان لوگوں کی کہانی سنانے کی جنھیں میں بہت قریب سے جانتی ہوں اور جن سے مجھے ڈر نہیں لگتا اور جن کی کہانیوں کو میں اختتام تک پہنچا سکتی ہوں۔ امیرو خاں ظمیرو خاں تو ایک کبھی نہ ختم ہونے والی داستان کے کردار ہیں، شاید اسی لیے شمسی چچا بھی اسے کبھی پورا نہ کر سکے۔

لیکن ٹھہریے...... فضلو بابا کی کہانی میں بھی کیسے ختم کروں؟ ان سے ملے زمانہ گزر گیا۔ تین برس ہوئے کہ میں

Scanned by CamScanner

وطن نہیں گئی ہوں...... وطن جسے عورتیں اپنی زبان میں مائیکہ کہتی ہیں اور جو انھیں بہت عزیز ہوتا ہے...... لیکن کہانی تو مکمل کرنی ہے۔ میں گیارہ بجے رات کو ٹرنک کال کرتی ہوں۔ میرا بھتیجا فون اٹھاتا ہے اور اتنی رات کو میری آواز سن کر گھبرا سا جاتا ہے۔

''پھپھو! کیا بات ہے؟ سب خیریت ہے نا؟''

''ہاں بھیا، ابھی تک تو ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آج کل خیریت سے ہیں۔''

''فون کیوں کیا پھپھو؟''

''سنو وہ جو تھے فضلو بابا ٹنگ ٹنگ...... میرا مطلب جنھیں بچے ٹنگ ٹنگ کہہ کر چڑاتے تھے وہ آج کل کہاں ہیں، کس حال میں ہیں؟''

وہ اچانک خاموش ہو جاتا ہے، پھر ذرا رک کر کہتا ہے۔''یہ گیارہ بجے رات میں آپ نے فضلو پگلے کا حال جاننے کے لیے فون کیا ہے؟''

''ارے بھئی سوال مت کرو، میرے سوال کا جواب دو۔''

وہ ایک طویل سانس کھینچتا ہے۔''آپ کو معلوم ہے پھپھو، اس کی سب سے چھوٹی بیٹی بدایوں میں تھی۔ وہ اسے سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ پچھلے سال زچگی میں وہ شدید بیمار پڑ گئی۔ داماد کا خط آیا تو فضلو بے وقوف قرض ادھار لے کر بدایوں کے لیے روانہ ہو گیا۔ فضا ان دنوں بھی ایسی ہی خراب تھی۔ بدایوں اسٹیشن پر جو مسافر اردو کے نام پر ٹرین سے کھینچ کر مار دیے گئے، ان میں فضلو بھی تھا۔ لاش بھی گھر نہ آ سکی۔ اور کچھ پوچھنا ہے، بڑی پھپھو؟''

میں بغیر جواب دیے خاموشی سے ریسیور رکھ دیتی ہوں۔ ایک دبلا پتلا، جھکے ہوئے شانوں اور جھریوں بھرے اور مہربان چہرے والا بوڑھا نظروں میں گھوم جاتا ہے۔ ضرور اس کی حیران و پریشان روح آسمانوں کے درمیان چکراتی، گھومتی ہو گی اور پوچھتی ہو گی: ''ہم کا کا ہے مارئیو بھیا؟ کا بگاڑے رہیں تہار؟''

بجھے دل کے ساتھ برش اٹھا کر میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔ سونے سے پہلے بال سمیٹ کر ایک چوٹی گوندھ لینا میری عادتوں میں شامل ہے۔ لیکن یہ کیا؟ اچانک آئینے سے میرا چہرہ غائب ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ شانوں پر فضلو بابا کا چہرہ اگ آتا ہے۔ دہشت کی ایک سرد لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور برش ہاتھ سے گر جاتا ہے۔

ندی کے پانی میں تلاطم ہے، پنکھ پکھیرو بے چین ہیں اور خرگوش، ہرن اور میمنے خوف زدہ۔

❀❀❀

انیس اشفاق

اعراف

بتانے والے نے کسی کو یوں بتانا شروع کیا:

اس ہسپتال کو، جسے شہر سے دور ایک سنسان مقام پر زمین کے ایک بہت بڑے حصے پر بنایا گیا تھا، بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا، لیکن جن لوگوں نے دیکھا تھا ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا بندوبست کن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس ہسپتال میں الگ الگ امراض سے متعلق کئی وارڈ تھے۔ انھیں میں ایک ایسا وارڈ بھی تھا جس کی طرف بہت کم لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ یہ وارڈ باہر سے بہت پرانا اور بوسیدہ نظر آتا تھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس وارڈ میں صرف دو بستر تھے اور ان دو بستروں پر دو ایسے مریض تھے جنھیں گم نام علاقوں سے لایا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان مریضوں کو وہاں رہتے ہوئے زمانہ گزر چکا ہے لیکن ابھی تک وہ شفایاب نہیں ہوئے ہیں اور اسی لیے ابھی تک انھیں اس ہسپتال سے چھٹی نہیں دی گئی ہے۔ وارڈ کی طرف آنے جانے والے بتاتے ہیں کہ انھوں نے وہاں کبھی کسی معالج کو نہیں دیکھا لیکن وارڈ کے مریض اپنے معالجوں کو اچھی طرح جانتے تھے مریضوں کی نگہداشت کرنے والی نرسیں بھی وہاں کبھی نظر نہیں آئیں لیکن مریضوں کے آس پاس قرینے سے رکھے ہوئے سامان کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ نرسیں مریضوں کی نگہداشت کرتی رہتی ہیں۔ وارڈ کی صفائی کرنے والے ملازموں اور جمعداروں کو بھی کبھی کسی نے نہیں دیکھا لیکن وارڈ کے اندر کبھی گندگی نظر نہیں آئی۔

ان مریضوں کو جو گم نام علاقوں سے یہاں لائے گئے تھے یہ نہیں معلوم تھا کہ انھیں یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ بیماروں کی طرح ایک زمانے تک وارڈ میں رہنے کے بعد بھی ان کے معالجوں نے انھیں یہ نہیں بتایا کہ وہ کون سے مرض میں

Gul Zamin. 4 158. Vipul Khand. Gomti Nagar - 226010 (U. P.)

Scanned by CamScanner

مبتلا ہیں اور ان مریضوں نے بھی اپنے معالجوں سے کبھی نہیں پوچھا کہ ان کا مرض کیا ہے اور یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کی کہ انھیں یہاں سے کب چھٹی دی جائے گی۔ دونوں مریضوں نے اس وارڈ کو اپنا دائمی ٹھکانہ سمجھ لیا تھا اور اب انھیں اپنے شفایاب ہونے کی بھی کوئی فکر نہیں تھی۔

بتانے والے نے آگے بتایا:

اس وارڈ کی طرف کبھی کبھی آنے والے معالجوں میں سے ایک معالج نے اپنی یادداشتوں میں ان مریضوں کا حال اس طرح قلم بند کیا ہے:

''مجھے اس وارڈ کے معالجوں میں سے ایک معالج کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔ پہلی بار جب میں اس وارڈ میں داخل ہوا تو میں نے دو بستروں پر دو بہت کمزور اور نحیف مریضوں کو لیٹے ہوئے پایا۔ میرے داخل ہوتے ہی دونوں نے ایک بیمار مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں نے ان کی خیریت معلوم کی تو وہ خاموش رہے۔ میں نے ان کا معاینہ کیا، ضروری ہدایتیں دیں اور کچھ دوائیں تجویز کیں۔ میں جب تک ان کے پاس موجود رہا، وہ دونوں کوئی لفظ بولے بغیر مسکراتے رہے۔ معاینے کے بعد جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو دونوں میں سے کسی نے اپنی بیماری کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھا۔ لیکن اگر وہ پوچھتے بھی تو میں انھیں کچھ نہ بتا پاتا، کیوں کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کا مرض کیا ہے۔ جتنی دیر میں ان کے پاس بیٹھا رہا ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی دونوں کی صورتیں الگ الگ تھیں، لیکن دونوں کی آنکھوں میں ایک ہی طرح کی چمک تھی۔ بیماروں کی آنکھوں میں اس طرح کی چمک دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی لیکن اس چمک کے پیچھے وہ اذیت بھی دکھائی دے رہی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔ دونوں کے چہرے زردی مایل تھے اور ان پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان جھریوں پر بہت باریک لکیریں ایک دوسرے کو اس طرح کاٹ رہی تھیں کہ ان کے چہروں پر چھوٹے چھوٹے خانے بن گئے تھے دونوں کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ صاف رنگتوں والی ان عورتوں کی آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے سیاہ حلقے بہت خوب صورت معلوم ہو رہے تھے لیکن مجھے یاد ہے کہ ان سیاہ حلقوں کو دیکھ کر مجھے وہ پھندے یاد آنے لگے تھے جنھیں ماہر شکاری خطرناک اور خوں خوار جانوروں کو قابو میں کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے فوراً ان کی طرف سے اپنی آنکھ ہٹالی پھر میں نے ان کے جسموں پر نگاہ ڈالی جہاں گوشت کے نام پر صرف ہڈیاں تھیں۔ ہڈیوں سے جھانکتے ہوئے ان کے جسم لوہے کی باریک تیلیوں سے بنے ہوئے کسی زنگ آلود پنجرے کے اندر قید نڈھال پرندوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ وارڈ سے باہر نکلتے وقت ایک بار پھر میں نے انھیں پلٹ کر دیکھا۔ میرے اس طرح پلٹ کر دیکھنے پر وہ دونوں ایک ساتھ مسکرائیں۔ ان کی سرد اور سپاٹ مسکراہٹوں کو دیکھ کر خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میں تیزی کے ساتھ اس وارڈ سے باہر نکل آیا۔ اس دن کے بعد سے میں نے طے کر لیا تھا کہ اب میں ان مریضوں کو دیکھنے نہیں جاؤں گا لیکن ہسپتال کے منتظمین کا حکم تھا کہ میں ان مریضوں کا خیال رکھوں اور انھیں یقین دلاتا رہوں کہ وہ جلد سے جلد

Scanned by CamScanner

صحت یاب ہو جائیں گے دوسروں کی طرح میں نے بھی ہسپتال کے منتظمین کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہاں کے دوسرے معالجوں کی طرح مجھے بھی روز کے روز ہدایتیں مل جاتیں کہ آج مجھے کن کن مریضوں کو دیکھنا ہے لیکن ان مریضوں میں ہسپتال کے منتظمین کی خصوصی دل چسپی تھی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ میری ہی طرح دوسرے معالج بھی اس وارڈ کے مریضوں کو دیکھنے آتے ہیں لیکن میں نے اپنے سوا کسی اور معالج کو وہاں کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی ان مریضوں نے مجھے بتایا کہ ان کے دوسرے معالج کون ہیں اور وہاں کب کب آتے ہیں۔ میں بہت دنوں تک اس ہسپتال میں معالج کے طور پر ملازم رہا اور جب میں نے وہ ہسپتال چھوڑا اس وقت دونوں مریض اسی وارڈ میں موجود تھے۔''

بتانے والے نے یہ باتیں جسے بتائیں، ایک دن یہ باتیں اس نے مجھے بتائیں۔ میں نے اس سے معالج کی یادداشتیں حاصل کر لیں اور انھیں پڑھنے کے بعد اس معالج کو شہر میں بہت ڈھونڈا لیکن نہ تو وہ مجھے کہیں ملا اور نہ کسی نے اس کے بارے میں مجھے ٹھیک ٹھیک بتایا۔ البتہ اس تلاش کے دوران ایک دن اتفاقاً مجھے اس ہسپتال کے معالجوں میں سے ایک اور معالج کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کچھ ورق مل گئے۔ یہ معالج بھی اس وارڈ کے لیے خصوصی طور پر مقرر کیا گیا تھا لیکن اس کے مندرجات میں ان مریضوں کا جو حال لکھا گیا تھا وہ پہلے والے معالج کی یادداشتوں میں لکھے ہوئے احوال سے مختلف تھا۔ اس معالج نے لکھا تھا:

''میں جس ہسپتال میں معالج کے طور پر مقرر ہوا ہوں وہاں ایک ایسا وارڈ ہے جو کسی مردہ گھر سے مشابہ ہے۔ باہر سے دیکھنے پر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے اندر سانس لیتا ہوا کوئی مریض موجود ہے۔ میں نے اپنی پوری ملازمت میں کسی بھی ہسپتال کے کسی بھی وارڈ میں ایسی الم ناک ویرانی کبھی نہیں دیکھی۔ وارڈ کے آس پاس بہت سے درخت ہیں لیکن ان کی شاخوں پر پرندے کبھی نہیں بیٹھتے اور میں نے انسانوں کو بھی ان درختوں کے سایے میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔ وارڈ کے دوسری طرف ایک وسیع میدان ہے جس میں دور تک کوئی درخت نظر نہیں آتا۔ یہ میدان اگرچہ اسی ہسپتال کا حصہ ہے لیکن اس پر کوئی عمارت نہیں بنائی گئی ہے۔ ہسپتال میں کام کرنے والے بتاتے ہیں کہ رات ہوتے ہی اس میدان پر سایے رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھیں سایوں کے خوف سے دن میں بھی کوئی اس میدان کی طرف نہیں جاتا۔ لیکن وارڈ میں رہنے والے مریضوں کو اکثر میں نے اس میدان میں چہل قدمی کرتے دیکھا ہے۔ ایسا کئی بار ہوا کہ جب میں ان مریضوں کے وارڈ میں داخل ہوا تو انھیں وہاں سے غائب پایا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ٹہلنے کے لیے میدان کی طرف گئے ہیں۔ دونوں مریض ایک ہی طرح کے سے تھے اور مرض کی تشخیص نہ ہونے کے باوجود ظاہری آثار کی بنا پر کہا جا سکتا تھا کے دونوں ایک ہی مرض میں مبتلا ہیں۔ میں جب تک ان کے علاج پر مقرر رہا، ان کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکا۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے مرض کو سمجھتے تھے اور شاید وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے مرض کے بارے میں باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے اکثر انھیں ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھا تھا لیکن وارڈ میں داخل ہونے پر مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے انھوں نے اپنی گفتگو کا موضوع بدل

Scanned by CamScanner

لیا ہے لیکن موضوع بدلتے بدلتے کچھ لفظ ان کی گفتگو میں ایسے آجاتے جن سے با آسانی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ ان کی پہلے کی گفتگو کا موضوع کیا تھا اور میں ان کی پہلے کی گفتگو کے موضوع کے بارے میں سوچ کر یہ سوچنے لگتا کہ یہ موضوع کیا رہا ہوگا؟ جو کچھ میں سوچتا وہ کچھ اس طرح ہوتا:

''دونوں اپنی لاعلاج بیماری کے بارے میں بات کر رہے ہوں گے اور ان معالجوں کا مذاق اڑا رہے ہوں گے جو ان کا مرض معلوم کرنے اور انھیں پوری طرح ٹھیک کرنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ لاعلاج مرض میں بہت جلد مر جانے کے خیال سے وہ دونوں ایک دوسرے کی زندگیوں کے بارے میں بہت کچھ پوچھ رہے ہوں گے کہ اس جان لیوا مرض میں ابھی وہ اور کتنے دن تک زندہ ہیں گے۔''

معالج کی یادداشتوں میں آگے لکھا تھا:

''میں جب جب اس وارڈ میں جاتا، دونوں مریضوں کو خوش خوش ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھتا۔ ان کی گفتگو کے موضوع بھی عجیب وغریب ہوتے۔ وہ عجیب الہیئت جانوروں کے بارے میں باتیں کرتے، ان خوف ناک جنگلوں کا ذکر کرتے جہاں ہر وقت اندھیرا چھایا رہتا ہے اور جن کے گھنے اور لمبے درختوں سے خوف ناک آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں اور وہ ایسے سمندروں کے قصے سناتے جہاں ہر وقت سیاہ آندھیاں اٹھتی رہتی ہیں۔ میں نے انھیں ایسے پہاڑوں کے بارے میں بھی باتیں کرتے سنا جن کی چوٹیاں کٹے ہوئے سروں کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی بات چیت میں ایسی زمینوں کا بھی ذکر آتا جن پر آسمان سے ہمیشہ خون برستا رہتا ہے۔''

دوسرے معالج نے اپنی یادداشتوں میں بس یہیں تک ان مریضوں کا حال لکھا تھا۔

مریضوں کا یہ حال جان لینے کے بعد پہلے کی طرح میں نے اس معالج کو بھی شہر میں بہت تلاش کیا لیکن کوشش کے باوجود وہ کہیں نہ مل سکا۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی کہ دونوں معالج اسی شہر کے تھے لیکن شہر میں کوئی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ معالجوں کی یادداشتوں میں لکھے ہوئے مریضوں کے احوال نے میرے اندر ان مریضوں کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق پیدا کر دیا۔ میں اس ہسپتال کے بارے میں بالکل نہیں جانتا تھا جہاں یہ مریض داخل کیے گئے تھے اس لیے سب سے پہلے میں نے اس ہسپتال کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ شہر سے دور ایک غیر آباد علاقے میں واقع ہے لیکن بتانے والوں کو ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم تھا کہ اس غیر آباد علاقے کی طرف شہر کا کون سا راستہ جاتا ہے۔ جب مجھے ہسپتال کی طرف جانے والے راستے کا کوئی سراغ نہیں ملا تو میں اپنے آپ ایک طرف چل پڑا۔ میں نے سوچا تھا کہ کچھ دیر کی مسافت کے بعد میں اس غیر آباد علاقے میں پہنچ جاؤں گا جہاں وہ ہسپتال موجود ہے لیکن بہت دیر تک چلنے کے بعد بھی وہ غیر آباد علاقہ نظر نہیں آیا اور میں نے سوچا کہ میں شاید غلط سمت میں نکل آیا ہوں۔ یہ سوچتے ہی میں نے شہر کے دوسرے حصے کا رخ کیا لیکن جیسے ہی میں نے اپنا رخ بدلا مجھے کچھ سواریاں نظر آئیں جن میں کچھ ایسے لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن کی شکلیں بیماروں جیسی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ

Scanned by CamScanner

سواریاں اسی راستے پر جا رہی تھیں جس پر میں پہلے چل رہا تھا۔ میں نے اپنی راہ بدلی اور ان سواریوں کے پیچھے پیچھے یہ سوچ کر ہو لیا کہ ہو نہ ہو یہ اسی ہسپتال کی طرف جا رہی ہیں جسے میں ڈھونڈ رہا ہوں۔ سواریاں دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے لوگ بھی خاموش تھے اور انھیں چلانے والے بھی کچھ نہیں بول رہے تھے۔ بہت دیر بعد سواریاں ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئیں جہاں آبادی ختم ہو رہی تھی۔ اب دیر دیر بعد اکادکا لوگ نظر آتے۔ چلتے چلتے سواریاں اس میدان میں پہنچ گئیں جو بہت دور تک ویران نظر آتا تھا۔ میں نے اس میدان میں بہت دور تک نظر دوڑائی لیکن بہت دور تک مجھے کوئی درخت نظر نہیں آیا۔ میں نے سوچا، میدان سے گزرنے والے تیز دھوپ میں کہاں قیام کرتے ہوں گے۔ سواریاں آگے بڑھتی رہیں اور میں سواریوں کے پیچھے چلتا رہا۔ شام ہوتے ہوتے بہت دور پر ایک چہار دیواری نظر آئی اور سواریاں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسی کے قریب جا کر رک گئیں۔ سواریوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا میں بھی چہار دیواری کے پاس جا کر رک گیا۔ اب میں نے دیکھا کہ یہ چہار دیواری بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی جس کے رقبے کا اندازہ لگانا آسان نہ تھا۔ چہار دیواری کے اندر عمارتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ سواریاں چہار دیواری کے داخلی دروازے کی تلاش میں پھر آگے بڑھنے لگیں۔ کچھ دور چلنے کے بعد محرابی شکل کا ایک بہت بڑا آہنی پھاٹک دکھائی دیا۔ سواریاں وہاں جا کر رکیں تو دروازے پر موجود پہرے داروں میں سے ایک نے وہ آہنی پھاٹک کھول دیا۔ شاید اسے معلوم تھا کہ سواریوں میں بیماروں کو لایا گیا ہے۔ سواریاں اندر داخل ہو گئیں اور جب ان کے پیچھے پیچھے میں نے اندر داخل ہونے کی کوشش کی تو پہرے داروں نے مجھے روک کر مجھ سے کہا:

''تم تو بیمار نہیں ہو؟''

''نہیں''، میں نے کہا۔

''پھر تم اندر نہیں جا سکتے اندر صرف بیماروں کو لے جایا جاتا ہے۔'' ان میں سے ایک پہرے دار نے آگے بڑھ کر سختی سے کہا: ''یہاں مریض کی دیکھ بھال باہری لوگ نہیں کرتے''، پہرے داروں میں سے ایک بولا۔ ''میں باہری نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن تم اندر کے بھی نہیں ہو۔'' سب سے آگے والا پہرے دار بولا۔

''مجھے ان مریضوں کے، جن کی دیکھ بھال کے لیے میں یہاں آیا ہوں، معالجوں نے بھیجا ہے۔'' میں نے کہا اور پھر ان پہرے داروں کو مریضوں کی وہ تفصیل بتائی جو مجھے معالجوں کی لکھی ہوئی یادداشتوں سے حاصل ہوئی تھی۔ یقین کے ساتھ بتائی ہوئی میری تفصیل پر پہرے داروں کو یقین آ گیا اور انھوں نے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اجازت ملتے ہی میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ہسپتال کے اس حصے کو ڈھونڈنے لگا جس کا کچھ کچھ نقشہ معالجوں کی یادداشتوں میں پیش کیا گیا تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد کچھ کچھ فاصلے پر بنی ہوئی ہسپتال کی عمارتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ یہیں ایک بڑا میدان شروع ہوتا تھا۔ یادداشتوں کے مطابق اسی میدان کے بعد ان دونوں مریضوں والا وارڈ تھا۔ میں نے میدان کے اس طرف نگاہ دوڑائی تو مجھے دھندلی دھندلی سی ایک عمارت نظر آئی۔ میں نے جلدی جلدی اس میدان کو طے کرنا شروع کیا۔ جیسے جیسے میدان ختم ہوتا جاتا،

Scanned by CamScanner

مریضوں والی عمارت کے نقوش واضح ہوتے جاتے، یہاں تک کہ میں وارڈ کے بالکل قریب پہنچ گیا اور اب میں نے دیکھا کہ گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے جو عمارت موجود ہے اس کی دیواریں جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ہیں اور ان پھٹی ہوئی جگہوں میں کچھ پیڑ اگ آئے ہیں جن کی جڑوں نے ان پھٹی ہوئی جگہوں میں اور دراڑیں پیدا کردی ہیں۔ وارڈ کی دیواروں پر جگہ جگہ کائی جمی ہوئی تھی اور جہاں کائی نہیں تھی وہاں چٹخی ہوئی دیواروں سے پانی رسنے کی وجہ سے نمی کے نشانات صاف نظر آرہے تھے۔ وارڈ کا چوبی دروازہ بہت پرانے زمانے کا معلوم ہوتا تھا جس کے دونوں پلّوں کے درمیانی حصوں پر جہاں وہ ایک دوسرے سے ملتے تھے، لوہے کے دو بڑے بڑے کڑے لٹک رہے تھے۔ انھیں کڑوں میں قفل پھنسا کر دروازے کو مقفل کیا جاتا ہوگا۔ دروازے کے دونوں پلّوں پر بہت عمدہ قسم کی نقاشی کی گئی تھی لیکن اس کا بڑا حصہ مٹ چکا تھا۔ جو آدھی ادھوری نقاشی بچ رہی تھی، اسی سے اس کی عمدگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ہسپتال کی نئی طرز کی عمارتوں کے مقابل اس چہار دیواری میں یہ پرانی طرز کی عمارت عجیب سی معلوم ہوتی اور اسی لیے یہ خیال گزرتا تھا کہ ہسپتال بننے سے یہ عمارت اس میدان میں موجود رہی ہوگی اور اسی عمارت سے چہار دیواری والے میدان کی شاخت کی جاتی رہی ہوگی، اسی لیے ہسپتال کے منتظمین نے میدان کی پرانی شناخت کو باقی رکھنے کی غرض سے اسے منہدم کرنے کے بجائے ایک وارڈ میں بدل دیا۔

وارڈ کے دروازے پر پہنچ کر میں ایک لمحے کے لیے رکا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ عمارت کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک آنے والا اور یہاں سے آگے جانے والا راستہ خالی پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں سے اس طرف سے کسی کا گزر نہیں ہوا ہے۔ دروازے پر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد میں ڈرا ڈرا سا اندر داخل ہوا اور اندر میں نے وہی دیکھا جو کچھ یادداشتوں میں لکھا گیا تھا۔ دونوں مریض لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید یہ ان کے آرام کا وقت تھا۔ صاف اور سفید چادروں پر لیٹے ہوئے وہ دونوں مریض دو مقدس پیروں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ مریضوں سے اپنی نگاہ ہٹا کر میں نے پورے وارڈ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وارڈ بہت بڑا تھا جس کے ایک حصے کے بیچوں بیچ دیوار سے لگے ہوئے دونوں مریضوں کے پلنگ تھے دوسرے حصے میں ایک میز تھی جس کے ایک طرف تین کرسیاں تھیں اور دوسری طرف ایک بڑی کرسی۔ یہ نرسوں اور معالج کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ مریضوں کے بستر کے پاس پلنگ کی اونچائی کی ناپ کی الماری تھی جو عموماً دواؤں اور مریضوں کے کھانے پینے کی چیزوں کو رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اسی الماری کے پہلو میں لکڑی کا ایک اسٹول بھی تھا جس کے اوپر کا گول حصہ خاصا پھیلا ہوا تھا۔ اسٹول پر ایک طرف ایک کونے میں صراحی رکھی تھی جس کے منہ کو سفید رنگ کے ایک چھوٹے سے جالی دار کپڑے میں ڈھک کر اس پر خوب صورت نقش و نگار والے تانبے کے ایک کٹورے کو اوندھا رکھ دیا گیا تھا۔ اسٹول کے باقی حصے پر خوش نما بیل بوٹے والی چینی کی طشتریوں میں کچھ پھل اور میوے رکھے تھے اور وہیں پر ایک نقشی پان دان تھا اور اسی پان دان کے پاس ایک چھوٹا سا آئینہ جس کی پشت پر کے بیشتر حصے کی پالش اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی۔ دونوں مریضوں کے ایک ہی طرح کے ساز و سامان کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔

Scanned by CamScanner

وارڈ کا پختہ فرش اگر چہ بہت پرانا تھا لیکن اس کی صفائی کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ اسے دن میں کئی بار صاف کیا جاتا ہے۔ معالج کی میز پر کچھ شیشیاں تھیں جن میں کچھ میں سفوف اور کچھ میں گولیاں تھیں جنھیں دوائیوں کے طور پر استعمال کیا جاتا ہوگا۔ معالج کی میز کے اس حصے پر جدھر اس کی کرسی تھی، کچھ کاغذ قرینے سے رکھے ہوئے تھے جن میں مریضوں کو دی ہوئی اور دی جانے والی دواؤں کی تفصیل تھی اور ان کی روز کی حالتوں کے اندراجات تھے۔

معالج کے آنے اور مریضوں کے بیدار ہونے کا انتظار کرتے کرتے میں نے وارڈ کو اندر سے اچھی طرح دیکھ ڈالا۔ ایسی بے رونقی اور اداسی میں نے بہت کم عمارتوں میں دیکھی تھی۔ وارڈ کے اندر کے حصے کو دیکھ کر یہ بات بار بار پریشان کر رہی تھی کہ اتنے بڑے حصے میں صرف دو مریضوں کو کیوں رکھا گیا ہے۔ وارڈ کا اچھا خاصا حصہ خالی تھا اور یہ خالی حصہ وارڈ کی ویرانی اور وحشت میں اور اضافہ کر رہا تھا۔ وارڈ کی چھت سے لٹکے ہوئے بہت پرانی وضع کے دو برقی پنکھے ایک خاص طرح کی آواز کے ساتھ اتنے آہستہ چل رہے تھے کہ ان کے پروں پر جمی ہوئی گرد صاف نظر آ رہی تھی۔ سکوت اور سناٹے کی اس فضا میں پنکھوں کے پروں کی خاص طرح کی آواز نے ایک عجیب سا خوف پیدا کر دیا تھا۔ مریضوں کے روز کے معائنے کے لیے معالج کے آنے کا وقت قریب آ چکا تھا لیکن معالج کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ معینہ وقت کے گزر جانے کے بعد بھی معالج کے نہ آنے سے مجھے پریشانی ہوئی لیکن اس درمیان دونوں مریضوں کی آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہوتے ہی دونوں نے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا پھر مجھے اور پھر دونوں نے ایک ساتھ مجھ سے پوچھا:

''تم کون ہو؟''

''آپ کا معالج'' میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔

''ہم اپنے معالج کو پہچانتے ہیں۔'' ان میں سے ایک جماہی لیتے ہوئے بولا۔ ''تم وہ نہیں ہو۔''

''ہمارے مرض کو پہچانتے ہو؟'' دوسرا مریض بولا۔

''نہیں، ابھی میں نے آپ کو دیکھا ہی کہاں ہے۔'' میں نے کہا۔

''دیکھنے کے بعد بھی نہیں بتا سکتے کہ ہمارا مرض کیا ہے۔''

''لیکن......'' میں کہتے کہتے رکا پھر کہا: ''تشخیص کے بغیر بھی بہت سے مرض ٹھیک کیے جا سکتے ہیں۔''

میری اس بات پر وہ دونوں ہنس دیے۔

''ہمارے پہلے والے معالج کہاں ہیں؟'' پہلے مریض نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم'' وہ پھر ہنس دیے۔ پھر ایک بولا: ''ہمارے بہت سے معالج بدلے گئے لیکن کوئی ہمارا مرض بتانے میں کامیاب نہیں ہوا۔''

''دیکھیے......'' اب میں نے سچ بتا دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔ ''سچ بات تو یہ ہے کہ میں آپ کا معالج نہیں

Scanned by CamScanner

ہوں۔''

''پھر کون ہو تم؟''

''میں صرف ...... دیکھنے آیا ہوں کہ آپ کے پہلے کے معالجوں نے ...... بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا:''جو کچھ آپ کے بارے میں لکھا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔''

''لیکن پہلے والے معالج ہیں کہاں؟''ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''کہا نا...... نہیں معلوم میں نے ان کی یادداشتوں میں آپ کا حال پڑھا ہے۔''

''انھوں نے ہمارے بارے میں کیا لکھا ہے؟''

''وہی جو انھوں نے یہاں دیکھا تھا۔'' یہ بتانے کے بعد میں نے کہا:''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''وہ کیا؟''دونوں ایک ساتھ بولے۔

''ان معالجوں نے ایک سی بات نہیں لکھی ہے۔''

''ایک سی بات لکھ بھی نہیں سکتے''، پہلا مریض بولا۔''دونوں الگ الگ وقتوں میں آتے تھے۔''

''یہ بات نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''آپ کے بارے میں ان کے بیانات الگ الگ ہیں۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ایک معالج کا بیان دوسرے سے مختلف ہے''، میں نے کہا۔ پھر ان سے پوچھا:

''اچھا یہ بتائیے کہ وارڈ کے دوسری طرف کوئی میدان ہے؟''

''میدان؟''دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوے سوالیہ انداز میں ایک ساتھ کہا۔ پھر بولے:''میدان تو کوئی نہیں ہے۔''

''لیکن دوسرے معالج نے اس میدان کا حال لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ دونوں وہاں چہل قدمی کے لیے جایا کرتے تھے۔''

''نہیں ہم کسی میدان ویدان میں نہیں جاتے۔ بستر سے کبھی اترتے بھی ہیں تو اسی وارڈ میں رہتے ہیں۔''

''تو دوسرے معالج کا بیان غلط ہے؟''

''یہ اس کے ذہن کی اپج ہے۔''

''خیر، چھوڑیے ان باتوں کو، یہ بتائیے کہ آپ لوگوں کے لیے کوئی اور معالج مقرر ہوا؟''

Scanned by CamScanner

''نہیں۔مگر ہم نے آج سے تمھیں اپنا معالج مان لیا۔''

''علاج معالجے سے میرا کوئی تعلق نہیں''، میں نے کہا۔ پھر کہا:''آپ کہیں تو میں آپ کی تیمارداری کرسکتا ہوں۔''

''ہمیں کسی تیماردار کی ضرورت نہیں ہے''،ان میں سے ایک بولا:''معالج ہی ہمارا تیماردار ہے۔''

''اور وہ ابھی مقرر نہیں ہوا''، میں نے اس کا جملہ ختم ہوتے ہی کہا۔

''ہو بھی گیا تو کیا فائدہ۔ مرض کا تو ہمارے پتا چلتا نہیں''، دوسرے مریض نے بہت بے دلی سے کہا۔

''لیکن معالج کی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ دوائیں آپ کو دی جاتی ہیں۔''

''دی جاتی ہیں اور ہم یہ جانے بغیر کہ ہمارا مرض کیا ہے، انھیں استعمال بھی کرتے ہیں''، پہلا والا بولا۔

''آپ دونوں یہاں کب سے ہیں؟''میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

''ہمیں نہیں معلوم۔لیکن آنے جانے والے بتاتے ہیں کہ جب سے یہ ہسپتال بنا ہے ہم اسی وقت سے یہاں ہیں۔''

''اور آپ کی رہائش؟''میں نے مزید پوچھا۔

''یہی، جہاں ہم ہیں۔اور جب تک زندہ ہیں، شاید یہیں رہیں''،ان میں سے ایک نے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ لوگ یہاں آئے کہاں سے؟''

''کہیں سے لایا گیا تھا ہمیں۔کہاں سے لایا گیا تھا، یہ نہیں معلوم''،اب کے دوسرا بولا۔

باتوں کے دوران وہ دونوں مریض اپنی دوائیں بھی کھاتے رہے اور دواؤں کی کڑواہٹ کو کم کرنے کے لیے وہ پان بھی کھاتے رہے جو اپنے پان دانوں میں انھوں نے پہلے سے بنا کر رکھ لیے تھے۔

میں بہت دیر تک اُن دونوں مریضوں سے باتیں کرتا رہا اور ان کے معالج کے آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی ان کا معالج نہیں آیا۔میں نے سوچا کہ اب مجھے چلنا چاہیے اور یہ سوچ کر جیسے ہی میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا، دونوں مریض ایک ساتھ بولے:

''بیٹھو۔اتنی جلدی کیا ہے۔''

''اب مجھے چلنا چاہیے''،میں نے کہا۔

''تم یہیں رہ سکتے ہو، ہمارے ساتھ۔''

''لیکن......''یہ کہہ کر میں نے پورے وارڈ پر اس طرح نگاہ ڈالی جیسے پوچھ رہا ہوں کہ رہوں گا کہاں۔

''پڑے رہنا کہیں پر''ان میں سے ایک نے کہا۔ پھر دوسرا بولا''ہسپتال کے عملے میں سے کسی کو اعتراض ہوگا تو چلے جانا۔''

Scanned by CamScanner

اور پھر انھوں نے مجھے ایک چٹائی اور ایک تکیہ دے دیا۔ اور اس دن سے میں اسی وارڈ میں رہ کر ان کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اور جب مجھے ان کی دیکھ بھال کرتے کرتے کئی دن ہو گئے اور کوئی معالج نہیں آیا اور ان کی دوائیں ختم ہونے لگیں تو مجھے یہ فکر ستانے لگی کہ آگے کیا ہوگا۔ جب یہ اندیشہ بڑھنے لگا تو میں نے ان سے کہا:

''معالج نہیں آیا؟''

''آئے گا''، وہ بولے۔

''دوائیں ختم ہو رہی ہیں''، میں نے تشویش جتائی۔

''دوائیں ختم ہونے سے پہلے آئے گا، دوائیں بھی لائے گا''، انھوں نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''ہم ہسپتال کے کارخانے سے واقف ہیں، یہاں سب کام اسی وقت ہوتے ہیں جب انھیں ہونا چاہیے۔''

''تو معالج آئے گا؟''

''ضرور آئے گا۔''

یہ سن کر میں چپ ہو گیا۔ اب مجھے اس میدان کو دیکھنے کی فکر تھی جس کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے معالج نے لکھا تھا کہ دونوں مریض اکثر وہاں چہل قدمی کے لیے جایا کرتے ہیں لیکن جب سے میں اس وارڈ میں آیا تھا یہ دونوں مریض اس میدان کی طرف نہیں گئے تھے۔ میں نے طے کیا کہ اس میدان کو اس وقت دیکھنے جاؤں جب یہ دونوں مریض آرام کر رہے ہوں گے۔ اور جب ان کے آرام کا وقت آیا، میں دوسرے معالج کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق اس میدان کو دیکھنے نکل پڑا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے واقعی ایک میدان نظر آیا لیکن یہ نظر نہیں آیا کہ وہ میدان کہاں جا کر ختم ہوتا ہے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ میدان کہاں ختم ہوتا ہے، میں اس میدان میں بہت دور تک نکل گیا لیکن میدان کہیں ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آیا۔ میدان کا سناٹا دیکھ کر مجھے وحشت ہونے لگی اور تب میں نے پلٹنے کا ارادہ کیا اور جیسے ہی میں پلٹا میں نے دیکھا کہ دونوں مریض میرے آگے آگے چل رہے ہیں۔ میں نے انھیں آواز دی لیکن انھوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا پھر اچانک انھوں نے اپنی سمت بدلی اور ادھر کا رخ کیا جدھر میدان دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ میں انھیں دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا اور جب میں وارڈ میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دونوں مریض اپنے اپنے بستروں پر موجود ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے ان کے درمیان کوئی موضوع بڑی دیر سے چھڑا ہوا ہو۔

''کہاں تھے؟'' مجھے دیکھتے ہی دونوں نے پوچھا۔

''وہیں، جہاں آپ لوگ تھے۔'' میں نے جواباً کہا۔

''ہم لوگ...... کہاں تھے؟''

Scanned by CamScanner

''دوائیں بدلیں؟''

''نہیں وہی پہلے والی دوائیں ہیں۔''

باتیں کرتے کرتے میں نے محسوس کیا کہ ان مریضوں کے بستروں کی چادریں بہت صاف ہیں۔ انھیں شاید کچھ دیر پہلے بدلا گیا تھا۔ وارڈ میں ہر طرف صفائی تھی اور فرش بھی دھلا دھلایا معلوم ہو رہا تھا۔ مریضوں کے اسٹولوں پر چیزیں بھی سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں اور معالج کی میز کا سامان بھی قرینے سے لگا تھا۔ اس پر رکھے ہوئے کاغذوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ انھیں ابھی ابھی رکھا ہے۔ میں نے قریب سے ان کاغذوں کو دیکھا تو ان میں مریضوں کی حالتوں کے تازہ اندراجات تھے۔ میں ان اندراجات کو پڑھ سکتا تھا لیکن پڑھ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ تحریریں مرض سے متعلق ہیں یا دواؤں سے۔ میں جان لیوا امراض میں دی جانے والی بہت سی دواؤں کے بارے میں جانتا تھا لیکن کاغذوں کے اندراجات میں ان میں سے کوئی دوا موجود نہیں تھی۔

مریضوں سے باتیں کرنے اور وارڈ کی بدلی ہوئی حالت کا جائزہ لینے کے بعد میں پھر سے اپنی چٹائی پر آ کر لیٹ گیا۔ میں نے سونے کا ارادہ کیا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پھر بھی میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ چٹائی پر اسی طرح پڑے پڑے اچھا خاصا وقت گزر گیا۔ رات بہت ہو چکی تھی لیکن دونوں مریض جاگ رہے تھے۔ ان دونوں کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ مجھے سویا ہوا جان کر وہ دونوں دھیمی دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے لیکن میں ان کی سرگوشیاں صاف سن سکتا تھا۔ وہ دونوں اپنی آیندہ کی زندگیوں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ زندگیاں انھیں مر جانے کے بعد ملنے والی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے وہ دونوں ایسی دنیاؤں میں پہنچ گئے تھے جنھیں اِن زمینوں پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان دنیاؤں میں وہ سفید لباسوں میں ملبوس ایسے لوگوں کو دیکھ رہے تھے جن کے گرد روشنیوں کے ہالے تھے اور ان دنیاؤں میں وہ ایسے شاداب جنگلوں میں گھوم رہے تھے جن کے درختوں کی شاخوں پر ماہ تاب آویزاں تھے۔ اور وہ ایسے باغوں کی سیر کر رہے تھے جن کی نہروں کے شفاف پانیوں میں نیلے آسمان کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔ اور جن میں اڑتی ہوئی پریوں کے سنہرے پروں پر ستارے چمک رہے تھے اور وہ ایسے دریاؤں کے ساحلوں پر کھڑے تھے جن کی خوش رنگ موجوں پر بہتی ہوئی کشتیوں میں سوار لوگ آسمان کی طرف سر اٹھائے خوش لحنی کے ساتھ آسمانی صحیفوں کی تلاوت کر رہے تھے۔ اور وہ ایسی شاہ راہوں سے گزر رہے تھے جن پر آسمان سے وہ پاک پیمبر اتر رہے تھے جن کی عباؤں سے نور برس رہا تھا۔ اور وہ ایسی وادیوں میں چل رہے تھے جن میں نورانی صورتوں والی بیبیاں فروکش تھیں اور ان کی رداؤں پر آفتاب اپنا سایہ کیے ہوئے تھے۔

ان کی گفتگو میں دکھائی ہوئی دنیاؤں کا ہر منظر مجھے بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں ان منظروں کی خوش نمائی میں ایسا کھویا کہ مجھے نیند آ گئی۔ گہری نیند کے بعد صبح جب دیر سے میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے سارے بدن میں تکلیف محسوس

Scanned by CamScanner

ہونے لگی۔ چٹائی سے اٹھتے اٹھتے میں نے محسوس کیا کہ میرے بدن کا ہر حصہ دکھ رہا ہے۔ مجھے یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ اگر یہ تکلیف بڑھی تو میں ان مریضوں کی دیکھ بھال کیسے کروں گا۔ انھیں اپنی دوائیں دوبارہ مل چکی تھیں اور میں نے طے کیا تھا کہ میں انھیں وقت پر دوائیں دوں گا اور انھیں تجویز کی ہوئی غذائیں بھی صحیح مقدار میں صحیح وقت پر دوں گا۔ دونوں مریض بیدار ہو چکے تھے لیکن میں نے ان پر یہ نہیں ظاہر ہونے دیا کہ میں کسی تکلیف میں مبتلا ہوں۔ اپنی پوری قوت لگا کر میں بڑے جتن سے چٹائی سے اٹھا لیکن میرے اٹھتے اٹھتے دونوں مریضوں نے تاڑ لیا کہ مجھے کوئی تکلیف ہے۔

''ٹھیک تو ہو؟'' ایک مریض نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں۔''

''نہیں، تم جیسے تھے، ویسے نہیں ہو۔'' دوسرا بولا۔

''نیند نہیں آئی، سر بھاری ہے۔''

''نہیں، کوئی اور بات ہے۔'' پہلا والا بولا۔ ''تم ٹھیک سے کھڑے نہیں ہو پا رہے ہو۔''

''ہاں...... لگتا ہے کروٹ بدلنے میں...... کمر میں چک آ گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر ان کی تشفی کے لیے کہا: ''چلنے پھرنے سے ٹھیک ہو جائے گی۔'' یہ کہتے کہتے میں لڑکھڑا گیا۔ مجھے لڑکھڑاتا ہوا دیکھ کر دونوں مریضوں نے مجھے سنبھالنے کے لیے اپنے اپنے بستروں سے اترنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور لاچاری کے عالم میں میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک بولا:

''لیٹ جاؤ، تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔ معالج آیا تو ہم اس سے تمھاری تکلیف بتائیں گے۔''

میں سمجھ چکا تھا کہ میں دیر تک کھڑا نہیں رہ سکوں گا، اس لیے میں پھر چٹائی پر لیٹ گیا۔ میری تکلیف بڑھتی جا رہی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بدن کے کون سے حصے کو دبا کر اپنی تکلیف دور کروں۔ دونوں مریض میری بڑھتی ہوئی تکلیف سے پریشان تھے اور جیسے جیسے میرے منہ سے کراہیں نکلتیں، ان کے چہروں کی رنگت بدلنے لگتی۔ تکلیف کی شدت کی وجہ سے لفظ میرے منہ سے نہیں نکل رہے تھے لیکن آنکھیں بار بار وارڈ کے دروازے کی طرف اس امید میں اٹھ رہی تھیں کہ شاید کوئی معالج اس طرف نکل آئے۔ لیکن کوئی معالج اس طرف نہیں آیا اور میری آنکھیں وارڈ کے دروازے سے لگی کی لگی رہ گئیں۔ اس کے آگے مجھے کچھ یاد نہیں۔ تکلیف کی شدت کی وجہ سے شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہوش آنے پر مجھے بتایا گیا کہ میں کئی دن تک بے ہوش رہا اور میری یہ حالت دیکھ کر ان دونوں مریضوں کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ جو شخص مجھے یہ باتیں بتا رہا تھا، میں نے اسے معالج سمجھ کر اس سے کہا:

''معالج تم بہت دیر سے آئے۔''

''میں معالج نہیں ہوں'' اس نے ذرا غصے سے کہا۔

Scanned by CamScanner

''پھر کون ہو تم؟''

''ہسپتال کا ملازم۔ان دو نئے مریضوں کو یہاں لایا ہوں''،اس نے ان بستروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جن پر میں پہلے والے مریضوں کو دیکھا کرتا تھا۔

''اور وہ پہلے والے مریض؟'' میں نے ملازم سے پوچھا۔

''ان کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔''

''تو پھر میرے بارے میں یہ سب تمھیں کس نے بتایا؟''

''اس معالج نے جو یہاں پہلے مریضوں کو دیکھنے آیا تھا۔اسی نے تم کو بھی دیکھا۔''

ہسپتال کا ملازم یہ کہہ کر وارڈ سے باہر چلا گیا۔ میری تکلیف غائب ہو چکی تھی۔معالج نے شاید مجھے بے ہوشی کی حالت میں ٹھیک کر دیا تھا۔میں چٹائی سے اٹھا اور ان نئے مریضوں کے قریب پہنچ کر ان سے پوچھا:

''آپ......'' میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑے۔

''پہلے ہم یہیں تھے۔''

''اسی ہسپتال میں؟''

''ہاں، ہمیں چلے جانے والے مریضوں کا معالج مقرر کیا گیا تھا۔''

''وہ یادداشتیں......؟''

''ہمیں نے قلم بند کی تھیں۔''

''کیا شکایت ہے آپ دونوں کو؟''

''یہ تو، جو معالج ہمیں دیکھنے آئے گا وہ بتائے گا۔''

''پہلے والے مریضوں کو کیا شکایت تھی؟''

''پتا نہیں چل سکا۔ یہ بات شاید ہم نے اپنی یادداشتوں میں لکھی ہے اور شاید تم نے پڑھی بھی ہوگی۔''

''پڑھی ہے۔'' پھر میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔''پتا نہیں وہ دونوں یہاں سے ٹھیک ہو کر نکلے یا نہیں، یا انھیں اسی حالت میں چھٹی دے دی گئی۔''

یہ سن کر وہ بولے۔''ٹھیک ہو کر نہیں نکلے ہوں گے۔''

یہ سنتے ہی میں وارڈ سے باہر نکل آیا۔شام ہو چکی تھی میں ہسپتال سے باہر آنے کے بجائے اس میدان کی طرف چل پڑا جس کے بارے میں دونوں مریضوں نے بتایا تھا کہ وہاں کوئی طلسم ہے۔اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور میں اس میدان میں چلتا چلا جا رہا تھا اچانک مجھے اس میدان میں کچھ منظر دکھائی دینے لگے۔

Scanned by CamScanner

میں ، سفید لباسوں میں ملبوس ایسے لوگوں کو دیکھ رہا تھا جن کے گرد روشنیوں کے ہالے تھے اور میں ایسے شاداب جنگلوں میں گھوم رہا تھا جن کے درختوں کی شاخوں پر ماہ تاب آویزاں تھے اور میں ایسے باغوں کی سیر کر رہا تھا جن کی نہروں کے شفاف پانیوں میں نیلے آسمان کا عکس صاف نظر آ رہا تھا اور جن میں اڑتی ہوئی پریوں کے سنہرے پروں پر ستارے چمک رہے تھے اور میں ایسے دریاؤں کے ساحلوں پر کھڑا تھا جن کی خوش رنگ موجوں پر بہتی ہوئی کشتیوں میں سوار لوگ آسمان کی طرف سر اٹھائے خوش لحنی کے ساتھ آسمانی صحیفوں کی تلاوت کر رہے تھے اور میں ایسی شاہ راہوں سے گزر رہا تھا جن پر آسمان سے وہ پاک پیمبر اتر رہے تھے جن کی عباؤں سے نور برس رہا تھا اور میں ایسی وادیوں میں چل رہا تھا جن میں نورانی صورتوں والی بیبیاں فروکش تھیں اور ان کی رداؤں پر آفتاب اپنا سایہ کیے ہوئے تھے۔

میں چلتا جا رہا تھا اور یہ منظر ایک کے بعد ایک میری آنکھوں کے سامنے آتے جا رہے تھے اور مجھے نہیں معلوم کہ اس طرح چلتے چلتے میں اس میدان میں، جسے ان مریضوں نے طلسم کا میدان کہا تھا، کہاں تک نکل گیا۔

Scanned by CamScanner

اشتیاق سعید

وہ دونوں کون تھے؟

ان دنوں میں جون پور کے سیاہ تھانے پر تعینات تھا۔ایک رات اچانک ڈکیتی کی تفتیش کے سلسلے میں کیرا کت تھانے سے میرا ابلاوا آ گیا اور میری یہ بد قسمتی کہ جیپ کا ڈرائیور گھنٹہ بھر پہلے ہی مجھ سے اجازت لے کر اپنے گاؤں چلا گیا تھا جو میل دو میل کے فاصلے پر کہیں تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا سپاہی بھیج کر اسے بلوالوں پھر خیال آیا کہ جب وہ اپنے بال بچوں میں پہنچ ہی گیا ہے تو اسے کیوں ڈسٹرب کیا جائے...... جیپ خود میں بھی تو ڈرائیو کر سکتا ہوں! پھر کیوں نہ تنہا ہی چلا جاؤں؟ اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنی سروس ریوالور سنبھالی اور جیپ کی اسٹیرنگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

جاڑوں کی رات تھی۔ چاروں دشاؤں میں اندھیروں کا راج تھا البتہ کہیں کہیں بلب کی ٹمٹماتی زرد روشنی اندھیرے کا سینہ چیرتی معلوم ہوتی تھی جب کہ سیت لہری نے میری رگوں میں برف جمادی تھی لیکن میں اس کی پروا کیے بغیر جوشِ جوانی میں جس تیز رفتاری سے جیپ سڑک پر دوڑائے جا رہا تھا اسی تیزی سے میرا ذہن سوچ رہا تھا کہ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایسے موسم میں ہرگز سفر نہ کرتا۔ یقیناً میں خود نہ کرتا اگر مجھے اپنے افسرانِ بالا کی خوشنودی حاصل نہ کرنا ہوتی۔ ترقی کے لیے افسروں کو تو خوش کرنا ہی پڑتا ہے اور اس کے لیے ایسے خطرناک کارنامے بھی انجام دینے ہوتے ہیں......ابھی میں ان ہی خیالوں میں گم تھا کہ جیپ اچانک جھٹکے کھانے لگی اور آہستہ آہستہ اس کی رفتار دھیمی ہوتی گئی۔ میں چونک پڑا اور فوراً ایکسی لیٹر دبا دیا، گیئر بدلا لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس وقت میں مفتی گنج بازار سے گزر رہا تھا۔ ایک بار جی چاہا کہ جیپ یہیں روک دوں پھر سوچا کہ جیپ تو چل رہی ہے بھلے رفتار مدھم ہے تو کیا؟ یہی نہ کہ میں آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچوں گا چوں کہ مجھے اس بات کا خدشہ بھی تھا کہ اگر جیپ روک دی تو پھر اسٹارٹ ہوگی بھی یا نہیں، چناں چہ میں یہ رسک لیے بغیر

177/ 1A .Ayesha Manzil. Pipe Road. Kurla - Mumbai 400 070.

Scanned by CamScanner

آہستہ آہستہ ہی سہی آگے بڑھتا گیا۔

مفتی گنج بازار سے بہ مشکل تمام دو ڈھائی کلومیٹر ہی آگے بڑھا تھا کہ اچانک جیپ ایک جھٹکا لے کر ٹھہر گئی پھر لاکھ کوششوں کے باوجود اسٹارٹ نہ ہوئی۔ آخر بے بس ہو کر اسٹیئرنگ پر اپنا سر ٹکا دیا اور اس آفت سے نجات کے لیے من ہی من پرارتھنا کرنے لگا کہ اسی دوران اچانک میری سماعت سے ٹھک ٹھک کی آواز ٹکرائی۔ میں چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر تاریکی اس قدر چھائی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا تاہم میں آواز کی سمت دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ آخر کار ایک ہیولا سا دکھائی دے گیا جو ہاتھ میں قد برابر کی لاٹھی لیے قدم بہ قدم اسے سڑک پر پٹختے ہوئے میری جانب بڑھا آرہا تھا۔

جب اس کے اور میرے درمیان دس گز کا فاصلہ رہ گیا تو میں نے ڈپٹ کر پوچھا: ''کون ہے؟''

اُس کی اور سے کوئی جواب نہ پا کر میں اندر ہی اندر سہم گیا اور فوراً ہولسٹر سے اپنی سروس ریوالور نکال لی...... وہ ہیولا عین میرے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ میں نے دیکھا وہ پینسٹھ ستر سال کا بوڑھا تھا، حلیے سے کسان معلوم ہوتا تھا۔ چند لمحات ہم یوں ہی خاموش ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر اس سے قبل کہ میں اس سے کچھ کہتا اس نے لب کشائی کی:

''بابو جی! پاس ہی میری کٹیا ہے۔ چاہیں تو رات گزار سکتے ہیں۔''

مجھے اس کی تجویز پر قدرے حیرت ہوئی کہ یہ کیسا شخص ہے جو مجھ سے پوچھ گچھ کیے بغیر ہی............

''بابو جی یہ سب کچھ پوچھنے پچھارنے کا نہیں ہے اگر پالا مار دیا تو پریشانی بڑھ جائے گی۔'' مجھے تشویش میں مبتلا دیکھ کر وہ دوبارہ بول پڑا تھا۔

''وہ......وہ......ہم......میری جیپ......!''

''خراب ہوگئی ہے ناں؟''

''جی......جی ہاں''

''اب یہ صبح ہی ٹھیک ہو سکے گی۔'' وہ ایک دم سپاٹ لہجے میں بولا اور ٹھک ٹھک لاٹھی پٹختا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں بھی کچھ جانے بوجھے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ سڑک کے کنارے ایک گھنے باغ میں اُتر گیا۔ باغ پار کرتے ہی ایک پرانی طرز کی کوٹھی دکھائی دی۔ ہم جوں ہی کوٹھی کے قریب پہنچے دروازہ خود بہ خود کھلنے لگا۔ میں ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

''آؤ......آؤ بابو......رک کیوں گئے؟'' وہ بدستور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ اس دوران میری نگاہ کوٹھی کے دروازے پر جا ٹکی جہاں ایک نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ ہاتھ میں ایک روشن شمع لیے کھڑی تھی اور میں شدہ شدہ اس کے حسن کے طلسم میں کھوتا چلا گیا تھا۔

''کھڑے کیوں ہیں؟......آیئے ناں!'' اس نے بڑھ کر میرا ہاتھ تھام لیا اور نپے تلے قدموں سے چلتی مجھے کوٹھی

Scanned by CamScanner

کے اندر لے آئی، شمع دان میں شمع کو رکھا پھر کواڑوں کو بھیڑ کر چٹخنی چڑھا دی۔ اسی دم مجھے اس بوڑھے کا خیال آیا جس کے ساتھ میں یہاں تک آیا تھا اور میری نگاہیں اسے یہاں وہاں تلاش کرنے لگیں۔

''کیا بات ہے بابو جی؟ آپ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑی ہی لگاوٹ سے پوچھا تھا اور میں اناپاس ہی بوکھلانے لگا تھا۔

''وہ......وہ......؟''

''وہ میرے باپو تھے۔''

''لے......لے......لیک......لیکن......لیکن وہ گئے کہاں؟''

''باہر''

''کیا!'' میں چونک پڑا۔ باہر تو بہت ٹھنڈ ہے۔''

''سو تو ہے......لیکن ٹھنڈ کے بہانے اپنے کرتویہ سے کوتاہی تو نہیں کی جاسکتی نا؟''

''کرتویہ......کیسا کرتویہ؟''

''بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھانا، تھکے ہوؤں کو آرام پہنچانا اور بھوکوں کو کھانا کھلانا۔ باپو اسی لیے ساری رات سیوان میں گھومتے ہیں......خیر چھوڑیے ان باتوں کو اور آیئے میرے ساتھ۔''

وہ مجھے ایک نہایت ہی نفیس اور آراستہ کمرے میں لے آئی تھی جس میں ایک خوب صورت مسہری پر عمدہ قسم کا مخملی توشک بچھا ہوا تھا اور پائینتی اسی طرز کا ایک دیدہ زیب لحاف رکھا تھا۔ مسہری دیکھتے ہی میری پلکیں جھپکنے لگیں اور سارا جسم ٹوٹنے لگا جب کہ اس نے اپنی والہانہ نگاہیں میری آنکھوں میں پیوست کرتے ہوئے بڑے ہی احترام سے مجھے مسہری پر بٹھایا اور خود میرے قدموں میں بیٹھ کر جوتوں کا تسمہ کھولنے لگی۔ جوتے اتارنے کے بعد بڑے ہی سبک انداز میں مجھے بستر پر لٹا کر لحاف اوڑھا دیا......اور......اور نہ جانے کب میں نیند کی آغوش میں جا سمایا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا وہ ناشتے کی طشت لیے موجود تھی......میں نے ناشتے سے معذرت چاہی اور پھر کبھی آنے کا کہہ کر اس سے اجازت طلب کی۔ اس نے متبسم لبوں سے الوداع کہا۔ میں لپک جھپک کوٹھی سے باہر آیا اور تقریباً دوڑتا ہوا باغ عبور کر کے سڑک پر آ گیا۔ سامنے جیپ کھڑی تھی......جیپ کو دیکھتے ہی چونک پڑا کیوں کہ اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا۔ ابھی میں اس تعلق سے کچھ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ اچانک خیال آیا کہ میں اپنی سروس ریوالور حویلی ہی میں بستر پر چھوڑ آیا ہوں اور میں جھٹ پٹ دوبارہ باغ کی طرف لپکا......لیکن یہ کیا؟ کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی مجھے وہ کوٹھی دکھائی نہ دی......میں پس و پیش میں تھا کہ کہیں کوٹھی کے مخالف سمت میں تو نہیں چلا آیا۔ اسی آن سامنے درختوں کی آڑ سے ایک ادھیڑ عمر شخص آتا دکھائی دیا۔ میں نے اسے روک کر اس پرانی کوٹھی کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ کوٹھی کے بارے میں

Scanned by CamScanner

سن کر ہکا بکا رہ گیا اور بتایا کہ یہاں دور دور تک پرانی کوٹھی تو کیا نئی طرز کی بھی کوئی کوٹھی نہیں ہے..... پھر میں نے اسے رات کا سارا واقعہ کہہ سنایا۔ وہ سن کر ہنسنے لگا اور بہ مشکل تمام اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولا: ''صاحب! آپ نے رات کچھ زیادہ ہی پی لی ہوگی یا پھر کوئی سپنا دیکھا ہوگا۔''

میں نے اسے یقین دلانے کے لاکھ جتن کیے تاہم اسے یقین ہی نہ آتا تھا۔ اسی دوران دو بچے باغ کی جانب سے دوڑتے ہوئے ہماری طرف آئے اور کھڑے ہوکر ہانپنے لگے۔ انھیں ہانپتا دیکھ کر میرے ساتھ والے شخص نے ڈپٹ کر پوچھا:

''کا بے..... توں دونوں کہاں سے دوڑے چلے آ رہے ہو؟''

بجائے کوئی جواب دینے کے ان میں سے ایک نے جھٹ اپنی نیکر کی جیب سے ریوالور نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

''چچا..... ہم کا ای تمنچا ملا ہے۔''

ریوالور دیکھتے ہی میں نے اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ ''کہاں ملا تمھیں یہ؟''

''اُوہاں..... کھنڈر ماں'' وہ ایک جانب اشارہ کرتا ہوا بولا: ''ہم دونوں جنے اُوہاں کھیلنے گئے رہے اُوہیں دیکھے گرا رہا۔ پہلے تو ہم دونوں ڈیرا گئے لیکن آپ کے سڑک پہ جات دیکھا رہا بس سے سوچا، ہوئے نہ ہوئے آپے کا ہوئی۔''

ریوالور کی بازیافت سے میرا مرجھایا ہوا چہرا کھل اٹھا اور میں نے ان دونوں بچوں کی پیٹھ ٹھوک کر شاباشی دی پھر پرس سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر دیتے ہوئے کہا: ''لو بچو میری طرف سے مٹھائی کھالینا۔''

دونوں بچے نوٹ تھامتے ہوئے ہچکچا رہے تھے تو اس شخص نے انھیں نوٹ لینے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''لئے لے بے..... پولس دروغہ کا مال قسمت والن کے ملت ہے۔'' اور کھلکھلا کر ہنسنے لگا، مجھے بھی ہنسی آگئی پھر ادھر اُدھر کی گفتگو کے بعد میری ایما پر ہم سب اس کھنڈر کی طرف گئے جہاں بچوں کو ریوالور پڑی ملی تھی۔

کھنڈر پر وہ بات پوری طرح صادق آتی تھی کہ ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت حسین تھی۔'' پھر ان بچوں نے ایک چبوترہ نما مٹی کے تودے کی جانب اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ ریوالور یہیں پڑا تھا۔ وہ جگہ دیکھتے ہی میری ہڈیوں تک میں سہرن دوڑ گئی کیوں کہ مجھ پر اب پوری طرح سے یہ واضح ہو چکا تھا کہ رات میں جن کی میزبانی میں تھا وہ کون تھے؟

❀❀❀

Scanned by CamScanner

سید امین اشرف

مجھے اک مصرعۂ تر قندِ لب ہے
یہ بارانِ کرم فیضانِ رب ہے

قدم پانی پہ نظریں ہیں خلا میں
عجب اس شہر میں جینے کا ڈھب ہے

کھڑا ساحل پہ اکثر سوچتا ہوں
فراتِ آب جو کیوں جاں بہ لب ہے

سفر از راہِ دنیا سوئے دنیا
سوارِ ابلقِ دنیا عجب ہے

گئے وہ دن کہ سودائے طلب تھا
چراغِ طاق بھی اک پاسِ شب ہے

جو ملنا ہے وہی مل کر رہے گا
سوالِ بیش و کم بھی بے سبب ہے

وہ اچھا ہے مگر شہرت بری ہے
کہ فتنہ ہے، قیامت ہے، غضب ہے

وہ جیسا مجھ کو لگا پیشِ یار میں نے کہا
کھلا ہے پھول سرِ شاخسار میں نے کہا

عجیب شخص ہے رُوئے سخن ہے اور کہیں
گلِ دمیدہ و صوتِ ہزار میں نے کہا

گریز پائی تو اچھی نہیں لگی مجھ کو
خرامِ ناز کو موجِ بہار میں نے کہا

عجب تضاد کہ قدرت کا شاہ کار ہے وہ
اسی کو فتنۂ شہر و دیار میں نے کہا

کسی طرح بھی اسے دوستی نہیں کہتے
مٹھاس لب پہ، دلوں میں غبار میں نے کہا

کہا جو اس نے دگرگوں ہے عالمِ خاکی
طبیعتوں کا ہے یہ خلفشار میں نے کہا

یہ مدحِ یار حقیقت بھی ہے فسانہ بھی
کہ شاعروں میں ہے میرا شمار میں نے کہا

4/54, Gul-e-Samnan, Badar Bagh, Aligarh, U.P.-202002

Scanned by CamScanner

غلام مرتضیٰ راہی

اب کے موسم تھا سخت بارانی
میرے آنگن تک آئی طغیانی

چاہے عزت دے چاہے ذلت دے
ہم کو تسلیم اس کی من مانی

عیش و آرام کیا کسی کو ملا
مجھ پہ لاحق ہوئی پریشانی

ذات کا ہو کہ کائنات کا ہو
جتنا ادراک اُتنی حیرانی

مجھ سے مایوس ہونے والوں نے
خاک کچھ سرسری مری چھانی

کون دے گا مجھے خبر اس کی
مر کے گر ہوگیا میں لافانی

ٹھنڈی ہو جائے آگ اس کے لیے
چاہے ہو کھولتا ہوا پانی

میں نے جا جا کے یہاں تک اسے معلوم کیا
کہ تگ و دَو نے مری مجھ کو ہی معدوم کیا

ہم نے ماحول کو اپنے جہاں مسموم کیا
سانس کو صاف ہوا سے وہیں محروم کیا

صبح تک جس کے لیے میں نے جلائے رکھا
اسی سورج نے مری شمع کو معدوم کیا

پہلے کی ہم نے عطا خاص بلندی ان کو
پھر چھتیں ڈال کے دیواروں کو محکوم کیا

جنگلوں سے کیا مایوس زمیں کو ہم نے
اس نے دریاؤں کو برسات سے محروم کیا

کیسے کیا کیا نہ جتن اپنی تسلی کے لیے
جا کے حال اپنا ستاروں سے بھی معلوم کیا

Rahi Manzil, Pani, Fatehpur (U.P) 212 601

Scanned by CamScanner

شمیم عباس

بیٹھا ہی رہتا ہے ڈالے ہوئے ڈیرا کوئی
یہ مری ذات ہے یا رین بسیرا کوئی

اک اسی آس پہ جیتے جی مرے جاتے ہیں
رات ٹل جائے گی آئے گا سویرا کوئی

اس کا آجانا بھی اور اس کا نہیں آنا بھی
نہ اجالا کہیں ایسا نہ اندھیرا کوئی

اک کرن ، ایک کرن کاش ادھر آجاتی
اف یہ دنیا ہے یا بادل ہے گھنیرا کوئی

بس نہیں پائی وہ اک بستی تو اجڑی بھی نہیں
اب بھی آتا ہے لگا جاتا ہے پھیرا کوئی

دونوں دونوں کے کبھی کچھ تھے کبھی دونوں کا
اب مرا کچھ نہیں کوئی نہیں میرا کوئی

یہ تو میں ہی ہوں کہ جس نے یوں لٹایا خود کو
کیسے ممکن ہے کہ یوں لوٹے لٹیرا کوئی

کبھی کبھی اب کہیں کوئی اب
اگر یونہی ہے یونہی سہی اب

اُجاڑ منہ آرزو تمنا
ہے نامرادی بنی ٹھنی اب

ہوا ہے کیا کیا پتا کیا ہوگا؟
اچاٹ ہر ایک شئے سے جی اب

مصر بضد میں ہی تب تھا لیکن
جو تیری مرضی تری خوشی اب

میں کوئی کھونے کی چیز تھی کیا ؟
سوال کرتی ہے زندگی اب

مجھے کہ اب سوجھتا نہیں کچھ
تو تم کو سوجھی ہری ہری اب

رہی سہی بھی ترے حوالے
کسر ہے جو کچھ بچی کھچی اب

102-B/6, Rajeshwari, Sector 10, Shanti Nagar, Mira Road, Dist: Thane.

Scanned by CamScanner

رؤف خیر

جو جھکنے پر نہیں آتی وہ پیشانی ہے خطرے میں
بہت دن سے یہی سنتے ہیں سلطانی ہے خطرے میں

خرد مندوں کے ہاتھوں جانے کیا کیا دیکھنا ہوگا
ہے دانائی پشیماں اور نادانی ہے خطرے میں

برتی ہیں سماعت پر فقط قوالیاں پہروں
سخن ماتم کناں ہے مرثیہ خوانی ہے خطرے میں

تعجب ہے ، بغاوت پر ہے آمادہ بروٹس بھی
مہاراجہ گئے کب کے ، مہارانی ہے خطرے میں

مجھے منزل بہ منزل چپکے چپکے جب سے دیکھا ہے
عزیزانِ گرامی کی ہمہ دانی ہے خطرے میں

میری تنبیہ کو دنیا نظر انداز کرتی ہے
بڑی ہشیار بنتی ہے یہ دیوانی ہے خطرے میں

سلیقہ ہی نہیں ہے سیدھے سادے شعر کہنے کا
بصد مشکل پسندی خیرؔ آسانی ہے خطرے میں

زباں پہ حرف تو انکار میں نہیں آتا
یہ مرحلہ ہی کبھی پیار میں نہیں آتا

کھلے گا ان پہ جو بین السطور پڑھتے ہیں
وہ حرف حرف جو اخبار میں نہیں آتا

سمجھنے والے یقیناً سمجھ ہی لیتے ہیں
ہمارا درد جو اظہار میں نہیں آتا

یہ خاندان ہمارا بکھر گیا جب سے
مزا ہمیں کسی تہوار میں نہیں آتا

ہمارے حق میں تو وہ چاند اور سورج ہے
بہت دنوں سے جو دیدار میں نہیں آتا

کمال یہ ہے کہ ہم خواب دیکھتے ہی نہیں
کہ خواب دیدۂ بیدار میں نہیں آتا

وہ اپنا ذوق بڑھائیں اگر مزہ ان کو
رؤف خیرؔ کے اشعار میں نہیں آتا

H.No.9 -11-137/1, Moti Mahal, Golconda,Hyder Abad - 500 008.

Scanned by CamScanner

عبدالرحیم نشترؔ

بہت دنوں سے کوئی چیز ہی نہ دی اس نے
ہنر چھپا لیا پونجی سمیٹ لی اس نے

وہ ایک گاؤں تھا، اب شہر بن کے جیتا ہے
سڑک بنالی ہے اپنی ہر اک گلی اس نے

نظر میں پھول کھلے ہیں نہ چاند ہی چمکا
اداس اداس سی کرلی ہے زندگی اس نے

تپاک ہے نہ تکلف، نہ دوستی، نہ وفا
ہر ایک شخص سے رکھی ہے دشمنی اس نے

بچھالیا ہے جو بستر تو اب پڑے بھی رہو
گزرتی رات کی تجویز کب سنی اس نے

بہت شریف بہت بے وقوف تھا وہ شخص
تمام عمر گزاری ہے دکھ بھری اس نے

ہو خیر خواہ تو نشترؔ کی تعزیت کو چلو
سنا ہے کرلی ہے کل رات خودکشی اس نے

بچھا ہوا ہے بڑی دور تک کبھی کے لیے
اکیلا دشت ترستا ہے زندگی کے لیے

خزاں تو ایک بہانہ تھی سبز موسم کو
ہر ایک شاخ تھی زندہ نئی کلی کے لیے

کسی نے توڑ دی دیوارِ وقت، پار اترا
سر اپنا پٹختی ہر موج ہے ندی کے لیے

کہاں گئے وہ لپکتے ہوئے ہرے پتے
بچاری شاخ تڑپتی ہے تازگی کے لیے

اڑے طیور تو پھر لوٹ کر نہیں آئے
فضا میں رنگ نہیں سبز نغمگی کے لیے

یہ رات بال سمیٹے تو ڈوب جاؤں گا
میں زرد چاند ہوں بے روح چاندنی کے لیے

مجھے پکار رہی ہے بسیط تاریکی
اٹھاؤں رختِ سفر چل پڑوں اسی کے لیے

Scanned by CamScanner

شکیل گوالیاری

چشمِ تر کو ہے چاہ بارش کی
سرخ کی اور سیاہ بارش کی

اپنے گھر میں لگا کے خود ہی آگ
لوگ تکتے ہیں راہ بارش کی

شہر بھر کے کٹے درختوں نے
روک رکھی ہے راہ بارش کی

لے اڑی بادلوں کو بن برسے
تھی ہوا خیر خواہ بارش کی

جب کھلی آنکھ تب سنی میں نے
ہلکی ہلکی کراہ بارش کی

ناگہاں زرد ہوگیا پانی
یہ ندی ہے گواہ بارش کی

چلتا پھرتا درخت ہوں میں بھی
ڈھونڈتا ہوں پناہ بارش کی

پڑ گئی جس پہ کھا گئی اس کو
برق تھی یا نگاہ بارش کی

صبر کے گھونٹ پیجیے اس بار
پھا نکیے گردِ راہ بارش کی

Loha Garh, Lela Road, Larhkar, Gwalior, 474001.

Scanned by CamScanner

نعمان شوق

صحرا، درخت، پھول، سمندر نہیں ہوں میں
دیوار سے لگا کوئی منظر نہیں ہوں میں

مجھ کو سنبھال رکھا ہے کس احتیاط سے
پتھر کو بھی پتہ ہے کہ پتھر نہیں ہوں میں

ہاں! خوب مل چکی مجھے دیوانگی کی داد
لیکن ترے خیال سے بڑھ کر نہیں ہوں میں

آنکھوں کو انتظار کی لذت سے باز رکھ
کم ہوتے فاصلوں کا مقدر نہیں ہوں میں

کل موتیوں سے تول رہے تھے کلام وہ
کہنا ہی پڑ گیا کہ سخن ور نہیں ہوں میں

اتنا گھنا اندھیرا دلِ پاک باز میں
سو سو دعائیں مانگی گئیں اک نماز میں

کچھ یوں ہوئی ہیں شہر کی منصوبہ بندیاں
شاید بچے نہ فرق نشیب و فراز میں

دعویٰ کیا گیا کہ فضاؤں میں زہر ہے
لائے گئے کھلے ہوئے چہرے جواز میں

اب شور پر تھرکنے کا دستور ہے یہاں
کس کو خبر کہ روتی ہے اک روح ساز میں

کس نے کہا کہ عشق سے ناطہ نہیں رہا
دھاگے بچے ہوئے ہیں ابھی جانماز میں

A-501, Greater Noida-201306 (U. P.)

Scanned by CamScanner

خواجہ جاوید اختر

جی بھر کر مدہوش رہو
خود سے ہم آغوش رہو

کھل کر سامنے آجاؤ
یا پھر تم روپوش رہو

محفل میں کچھ کہنے سے
بہتر ہے خاموش رہو

جب کوئی عالم بولے
یار ہمہ تن گوش رہو

ہم کچھوے کی چال چلیں
تم ہی بنے خرگوش رہو

ہم ہیں میرؔ کے شیدا، تم
حلقہ بگوشِ جوشؔ رہو

D/129. G. T. B. NAGAR. KARELI. ALLAHABAD- 211016(U.P.).

Scanned by CamScanner

خالد عبادی

قدم قدم پہ ہمیں راستہ دکھاتا ہے
بچھڑنے والوں کو پھر سے وہی ملاتا ہے

لگے جو پیاس تو دیتا ہے بادۂ رنگیں
لگے جو بھوک تو پتھر ہمیں کھلاتا ہے

ہمارے دل میں نہاں ہے وہ نورِ سلطانی
زمانہ جس کی طلب میں فریب کھاتا ہے

مرے رفیق! مرے ہم سفر! مرے محبوب!
یہ کون ہے جو مرے ساتھ ساتھ گاتا ہے

کبھی یہ راہ گزاروں میں ٹمٹماتا تھا
اب انجمن میں تیری اعتبار پاتا ہے

یہ سوچ سوچ کے حیرت میں ہیں جہاں والے
کہ مال پانی عبادی کہاں سے لاتا ہے

ہنستا ہے یہاں کوئی روتا ہے یہاں کوئی
پاتا ہے یہاں کوئی کھوتا ہے یہاں کوئی

پنجرے میں ترے اپنی بس اتنی حقیقت ہے
مینا ہے یہاں کوئی طوطا ہے یہاں کوئی

اے بوڑھیو! بیٹوں کا دیدار نہیں ہوگا
ناتی ہے یہاں کوئی پوتا ہے یہاں کوئی

جب پھول ہے دامن میں اور چہرہ گلستاں ہے
توراہ میں کیوں کانٹے بوتا ہے یہاں کوئی

کیا نام پتہ اس کا ، احوال و کوائف کا
ہوتا تھا یہاں کوئی ہوتا ہے یہاں کوئی

C/o. Book Emporium, Sabzi Baugh, PATNA- 4

Scanned by CamScanner

کلیم ضیا

دل کو نہ جانے روگ یہ کس نے لگا دیا
راتوں کو جاگنے کا سلیقہ سکھا دیا

انساں، شجر، حجر ہو کہ ہو بحروبر کی بات
موسم نے سب کو رنگ بدلنا سکھا دیا

امید کا چراغ ہی تھا یار آخری
ظالم ہوا نے اُس کو بھی آخر بجھا دیا

تنہائیوں میں تیرے تصور نے پھر مری
تاریک وادیوں کو منور بنا دیا

دو بھائیوں کے بیچ کی دیوار کے لیے
آنگن کا سایہ‌دار شجر ہی گرا دیا

رشتے بھی کاروباری مزاجوں میں ڈھل گئے
دنیا نے چاہتوں کا تماشا بنا دیا

کیا پھر کسی کو خوں کی ضرورت پڑی ہے آج
زخموں کو تم نے پھر سے ضیاؔ کیوں سجا دیا

اک نگہ ڈال دے مجھ پر تو سنور جاؤں گا
نور بن کر تیری دنیا میں بکھر جاؤں گا

آسماں سر پہ، نہ ہے پاؤں کے نیچے ہی زمیں
تجھ سے بچھڑا تو بتا دے کہ کدھر جاؤں گا

شور کتنا بھی ہو باہر نہیں ہوگا کچھ بھی
اپنے اندر کی خموشی سے بھی ڈر جاؤں گا

دل کے تہہ خانے کو تو چاہے مقفل کر لے
تیری آنکھوں کے دریچوں سے اتر جاؤں گا

مجھ کو مرہم کی ضرورت ہے نہ ہمدردی کی
وقت کا زخم ہوں ہرحال میں بھر جاؤں گا

زندگی تو بھی سدا یاد کرے گی مجھ کو
کام کچھ ایسا ترے واسطے کر جاؤں گا

کس کو ہونا ہے جدا تجھ سے ضیاؔ بول ذرا
تجھ کو لے جاؤں گا ساتھ اپنے اگر جاؤں گا

22/Q-5, Shivaji Nagar, Govandi, Mumbai - 400 043.

Scanned by CamScanner

نذیر فتح پوری

ہیں بلند گھر جن کے آج آسمانوں سے
چھاؤں تک نہیں ملتی ان کے سائبانوں سے

کشتیاں چلانے کا حوصلہ نہیں جن میں
وہ لپٹ کے روتے ہیں صرف بادبانوں سے

سونے اور چاندی کا بھاؤ ہم سے مت پوچھو
پیار بانٹتے ہیں ہم درد کی دکانوں سے

خونِ دل سے لکھا ہے ہم نے ہر ورق اس کا
داستاں جدا اپنی ساری داستانوں سے

شام ہوتے ہوتے ہی سارے لوٹ آتے ہیں
پنچھیوں کو رغبت ہے اپنے آشیانے سے

Scanned by CamScanner

مناظر عاشق ہرگانوی

لاکھ رنج و غم بھری ہے زندگی
پھر بھی وجہِ دل کشی ہے زندگی

دیکھنے میں موم جیسی نرم ہے
پر برتنے پر کڑی ہے زندگی

سر پہ سورج ہے اگر مثلِ عذاب
ایک کارِ خیر بھی ہے زندگی

شہر بانو ہو کوئی کہ شہر یار
ساتھ کس کا دے سکی ہے زندگی

کام جس میں کر لو عاشق کچھ بڑے
ایک ایسی روشنی ہے زندگی

Scanned by CamScanner

ندیم فاضلی

کسی بھی روشن خیال سے آشنا نہیں ہے
جو آپ اپنے جمال سے آشنا نہیں ہے

اسے خیالوں میں جیسا چاہوں تراش لوں گا
ابھی نظر خدوخال سے آشنا نہیں ہے

ابھی تو دعوا ہے اس کو مشکل پسندیوں سے
ابھی وہ کارِ محال سے آشنا نہیں ہے

ابھی تو مٹی مہک اٹھی ہے نمی کو پاکر
ابھی وہ پانی کی چال سے آشنا نہیں ہے

سبیل برسوں کی کس لیے کر رہا ہے آخر
جو ساعتوں کے مآل سے آشنا نہیں ہے

مزاج حاوی رہا ہمیشہ ضرورتوں پر
فقیر حرفِ سوال سے آشنا نہیں ہے

غزل برائے غزل ہے تیری ندیم ابھی تو
غزل کے حسن و جمال سے آشنا نہیں ہے

رات کی زلف کبھی تا بہ کمر کھل جائے
ہم پہ بھی چاند ستاروں کی ڈگر کھل جائے

تھک گئی نیند مرے خوابوں کو ڈھوتے ڈھوتے
کیا تعجب ہے مری آنکھ اگر کھل جائے

میرا سرمایہ مرے پاؤں کے چھالوں کی تپک
راستے میں ہی نہ سب زادِ سفر کھل جائے

آج دریا نہیں کوزے میں سمانے والا
وقت ہے مجھ پہ مرا زعمِ ہنر کھل جائے

سب مسافر ہیں نئی راہ کی سب کو ہے تلاش
سب پہ ممکن تو نہیں راہِ دگر کھل جائے

اپنی تنہائی میں محبوس ہوں مدت سے ندیم
تو اگر ساتھ ہو دیوار میں در کھل جائے

236. Samru Baugh Chawl. New Gauri Pada. Bhiwandi. Dist: Thane 421302.

Scanned by CamScanner

خراج عقیدت

ایم. ایف. حسین

Scanned by CamScanner

ندیم صدیقی

مقبول فدا حسین کے فن اور ان کی انا کو سلام

ادھر دو تین دہوں سے دنیا بھر میں ایک عجیب انتہا پسندی نے جگہ بنالی ہے اور اچھے خاصے معتدل مزاج لوگ بھی اس 'سرطانی بخار' میں مبتلا ملتے ہیں ۔ہم جیسے لوگوں کے ذہن میں تو آج یہ بھی خیال سر اٹھاتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال جنھیں آج ساری دنیا علامہ اقبال کے نام سے یاد کرتی ہے کہ اپنی وہ شاعری جس میں انھوں نے 'ملاّ' کو بری طرح نشانہ بنایا ہے یا پھر ان کی مشہور ترین نظم 'شکوہ' آج لکھتے تو ان کا کیا حشر ہوتا یہ سوچ کر ہی ہم پریشان ہو جاتے ہیں ۔سر سید جن کے نام کے ساتھ ہم آج رحمت اللہ علیہ لکھنا لازمی جانتے ہیں ان کے ساتھ بھی کیا ہوا تھا یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ سب تاریخ کا حصہ بن گیا بلکہ اس حوالے سے بھی جب غور کیا تو احساس جاگا کہ مذکورہ انتہا پسندی کا بیج تو پہلے ہی بویا جا چکا تھا البتہ اس نے اس طرح سر نہیں اٹھایا تھا جیسے آج ہمارے سامنے منظر ہے۔فلم کا ذوق رکھنے والے حضرات ایچ.ایس.رویل کا نام نہیں بھولے ہوں گے وہ مشہور تو ہوئے فلم 'میرے محبوب' سے مگر ہم جیسوں کو یاد ہے ان کی وہ فلم جو انھوں نے ۱۹۶۸ء میں بہت ہی اہم موضوع پر بنائی تھی ۔'سنگھرش' کے حوالے سے جس میں دلیپ کمار کے ساتھ ہندی فلم کے اعلیٰ درجے کے فنکاروں نے کردار نگاری کی تھی یہ فلم ہندی ناظرین کی بد ذوقی کا شکار ہو گئی مگر اپنے موضوع اور فنی سطح پر ایک لاجواب فلم تھی البتہ یہی فلم آج کے دور میں بنتی تو فلم ساز و ہدایت کار ہرنام سنگھ (ایچ.ایس.رویل) کے ساتھ یوسف خان (دلیپ کمار) کی بھی خیر نہ ہوتی۔ فلم سنگھرش

C/o Urdu Times Daily. Fida House. 1st Floor. 110/118. Maulana Azad Road. Mumbai.

Scanned by CamScanner

میں بنارس کے پنڈوں کو موضوع بنایا گیا تھا بلکہ ان کی خباثت کو ریل نے دنیا کے سامنے بڑی فنکاری سے بے نقاب کیا تھا یہ فلم (اپنے موضوع کے اعتبار سے) اگر مغرب میں بنتی تو اسے نہ جانے کتنے ایوارڈ ملتے۔ ہمیں یہ باتیں مقبول فدا حسین کی 'غریب الوطنی' کی موت پر یاد آئیں۔ ہمارے ملک کا اتنا بڑا فنکار اور وہ جلاوطنی پر مجبور ہوا آخر اس نے یہ جلاوطنی کیوں اختیار کی؟ اس کے جواب میں یہی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ہندو دیوی دیوتاؤں کا برہنہ تصور اپنے برش سے پیش کیا تھا۔ یہاں لطف کی بات یہ ہے کہ حسین کی یہ پینٹنگس برسوں پرانی تھی مگر بیچارے کور ذہن اور کور چشم لوگوں کو ان پینٹنگس میں دیوی دیوتا پچیس برس بعد نظر آئے اور پھر حسین کے خلاف ہندوتو نے جو واویلا مچایا وہ سب کے علم میں ہے کہ یہ بہت پرانی بات نہیں۔ وہ اپنے خلاف چلنے والی تحریک سے دل برداشتہ ہوکر ۲۰۰۶ء میں ملک سے باہر چلے گئے تھے اور اب لندن کے قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ حسین اردو شاعری کے بھی دل دادہ تھے۔ وہ اکثر اکبرالہ آبادی کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر   ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا

وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اپنا بھی ایسا ہی حشر ہوگا۔ ایسے لوگ ہمارے ہاں ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ ایم. ایف. حسین کسی زمانے میں ممبئی کے مشہور 'گولا آرٹس' کے ہاں کام کرتے تھے اور وہ فلمی پوسٹر بنانے میں بہت ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان کی قدر کرنے والوں میں فلم 'مغلِ اعظم' کے مشہور زمانہ ڈائرکٹر کے آصف بھی شامل ہیں اور اس زمانے میں کے. آصف نے ان کے فن کو پہچانا، ان کی قدر کی اور کام دیا جب حسین آج کی طرح مشہورِ زمانہ نہیں تھے...... اردو ادب میں ایک اصطلاح عام ہے "صاحب اسلوب"...... سچ یہ ہے کہ جو بھی فن ہو اس میں یقیناً خال خال ہی ہیں جو صاحب اسلوب ہوں۔ ہم دیہی لوگوں میں ایک کہاوت مشہور ہے کہ کھیت سے ہری دھنیا چرا چھپا کر کوئی لے کر نہیں جا سکتا......! کیوں؟ جہاں جہاں وہ ہری دھنیا، چور لے جائے گا ہری دھنیا (اپنی خوشبو کے ذریعے) چیخ چیخ کر اعلان کرے گی کہ میں یہاں ہوں۔ اسی طرح صاحب اسلوب ادیب ہو، شاعر ہو یا کوئی فنکار، اس کے فن کی خوشبو ہی اس کا نام بن جاتی ہے۔ اس کی سامنے کی مثال ہماری زبان میں غالب، داغ اور اقبال جیسے شعرا ہیں۔ اسی طرح نثر میں بھی کئی نام تاریخ میں درج ہیں مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ نیاز فتح پوری، مولانا عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی ہمارے عہد میں ڈاکٹر ظ. انصاری وغیرہ (یہاں جو نام زبان پر آ گئے ان کا تذکرہ کر دیا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو زبان میں اس طرح کے لوگوں کی ایک کہکشاں موجود ہے) مقبول فدا حسین اسی قبیل کے بہت نمایاں صاحب اسلوب ہندوستانی فنکار تھے کہ ان کا فن پارہ ہزاروں فن پاروں میں ملا دیا جائے اور کسی بھی عام صاحب نظر سے کہہ دیا جائے کہ بتایئے اس میں سے 'حسین' کی پینٹنگ کون سی ہے؟ تو اسے بہت دیر نہیں لگے گی اور وہ حسین کا فن پارہ اٹھا کر سامنے رکھ دے گا۔ اس طرح کے برش یا قلم کے فن کاروں میں ہم نے (پاکستانی خطاط و آرٹسٹ اور شاعر) صادقین کے ساتھ ظفر آرٹسٹ (ظفر محمد بھوپالی)، فیض لاہوری اور شہاب آرٹسٹ کو دیکھا ہے اور یہ لوگ بھی اپنے اپنے فن میں صاحب اسلوب تشخص کے حامل تھے مگر مقبول فدا حسین کی بات ہی اور تھی۔ ان کو جو مقبولیت ملی وہ

Scanned by CamScanner

بھی انھی کا حصہ تھی۔ ان کے بارے میں یہ بات بھی عام ہے کہ وہ حسن پرست تھے۔ یقیناً وہ حسن پرست تھے اور وہ فن کار ہی کیا جو حسن پرست نہ ہو لیکن ان کی حسن پرستی کے پسِ پشت کہیں بھی بوالہوسی نہیں تھی (مادھوری دکشت نے ان کے انتقال پر جو بیان دیا ہے کیا وہ ہماری بات کی دلیل نہیں ہے کہ ''حسین کا باطن ایک بچے کی طرح معصوم تھا'') حسن پرستی عیب نہیں ہے کیوں کہ حسن تو فطرت کا مظہر ہے البتہ بوالہوسی کو ہم عذاب جانتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ حسن پرستی ہی تو حسن کاری کی طرف لے جاتی ہے۔ جو سب کو کہاں نصیب ہوتی ہے......

مقبول فدا حسین رنگ اور برش کے اس مقام پر پہنچ گئے تھے کہ وہ اپنے رنگ میں ڈوبا ہوا برش جہاں گھما دیتے تھے وہاں فن پارہ وجود پا جاتا تھا۔ اگر یہ کہہ دیا جائے تو کیا غلط ہے کہ فن پارے تو ان کے برش کی ایک گردش کے طالب ہوتے تھے۔ ہمیں یاد آتا ہے کہ بھنڈی بازار (ممبئی) کے مشہور نور محمدی ہوٹل میں وہ اکثر کھانے کے لیے آتے تھے۔ اس ہوٹل کے مالک خالد میاں نے ایک بار انھیں دیکھ لیا اور ان سے اپنے ہوٹل کے کھانوں کے بارے میں رائے جاننی چاہی۔ حسین کا برجستہ جواب تھا ''میاں کیا پوچھتے ہو؟ میں تو اکثر یہاں کھانے کے لیے آتا ہوں اور یہی ایک بات کیا تمھارے کھانے کی تعریف نہیں...... خالد میاں کا کہنا ہے کہ میں نے ان سے عرض کی کہ اسے آپ اپنے قلم یا برش سے لکھ دیں۔ واضح رہے کہ انھیں اس ہوٹل کا جو پکوان بہت پسند تھا وہ نلی نہاری تھا اور انھوں نے اسی وقت ایک مرغ بنایا اور اس کے اوپر ابھرتا ہوا سورج دکھایا...... یہاں کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ 'نہاری' کا تصور ہی صبح سے ہے اور مرغ تو خود صبح کی ایک علامت ہے کہ اس کی بانگ ہی تو ہے جو صبح کی نوید بن جاتی ہے۔ یہ بات حسین کے تحت الشعور میں پہلے سے ہی موجود تھی بس ہوٹل کے مالک کی فرمائش نے اس کو ان کے شعور سے ان کے قلم کے ذریعے کاغذ پر منتقل کر دیا...... یہ حسین کی ادنیٰ سی ایک مثال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنی تمام تر فنکارانہ صلاحیتوں میں اپنی مثال آپ ہی تھے۔ اچھا ہوا وہ ملک کے باہر چلے گئے ورنہ عجب نہیں کہ یہاں ان کا بھی وہی حشر ہوتا جو پاکستان میں ۱۹؍دسمبر ۲۰۰۷ء کو حسین ہی کے درجے کے ایک عالمی شہرت یافتہ پینٹر (۸۱؍سالہ) اسماعیل گل جی کا ہوا کہ کس نے انھیں، ان کی بیوی اور ایک ملازمہ کو کب قتل کیا آج تک پتا نہیں چلا۔ افسوس! یہاں یہ بھی بتانا ضروری نہیں کہ اس تہرے قتل کی خبر بھی لوگوں کو تین چار دن بعد ملی۔ تینوں لاشیں مسخ ہو چکی تھیں...... ہم یہ بات فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ''ہم نے حسین کو دیکھا تھا''۔ کسی نے صحیح کہا ہے کہ حسین کے ہاں ایک ضد تھی۔ انھوں نے اپنے فن کے آگے ملک سے دور جانا پسند کیا مگر فن کے معاملے میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا...... یہ بات معمولی شخص کر ہی نہیں سکتا اور وہ فنکار بھی نہیں ہو سکتا جس کے ہاں انا نہ ہو۔

ہم حُسین کی اس حُسین انا کو سلام کرتے ہیں۔ کیا ہمیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ انا اور انانیت دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ کمزور لوگ اپنی انا کی حدیں جلد پار کر لیتے ہیں اور پھر نتیجے میں انانیت انھیں نگل لیتی ہے۔ حسین نے غریب الوطنی کو اپنے لیے پسند کیا مگر ''کائروں'' کے آگے جھکے نہیں۔ ہم اُن کی اِس انا کو پھر سلام کرتے ہیں۔ فن کے پرستاروں کی زبان پر اس وقت بھی ہے اور کل بھی رہے گا...... حسین زندہ باد! زندہ باد!!

❀❀❀

Scanned by CamScanner

پرتھا چٹرجی

ہندوستان کے پکاسو......مقبول فدا حسین

ایم.ایف. حسین کے کام اور ان کی زندگی کی دو حصوں میں درجہ بندی نہیں کی جا سکتی۔ وہ آرٹ کو وہ خوشیاں لوٹانا چاہتے تھے جو انھیں اس شعبے سے حاصل ہوئی تھی۔ بروز جمعرات لندن کے ایک اسپتال میں مقبول فدا حسین نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ اس وقت ان کی عمر ۹۵ ربرس تھی۔ بہت کم لوگ ان کی شخصیت کی گہرائی کو جانتے ہیں۔

۱۹۹۰ء میں ایم.ایف. حسین کی کچھ پینٹنگ تنازعات میں الجھ گئی تھیں کیوں کہ ان میں ہندو دیوی دیوتاؤں کو انھوں نے برہنہ دکھایا تھا۔ جس پینٹنگ نے زیادہ بڑا تنازعہ کھڑا کیا وہ حسین نے ۱۹۷۰ء میں بنائی تھی لیکن اس پر ہنگامہ ۳۱ر سال بعد ہوا۔ حسین کو ہندو شدت پسندوں کی جانب سے جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں بھی ملنے لگیں اور قانونی مقدمات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ ساٹھ، ستر اور اسّی کے عشرے میں ایم.ایف. حسین مصوری کی دنیا پر جادوگر کی طرح چھائے رہے۔ جدید مصوری کو نئی سمت دینے والے اس فنکار کو ہندو فرقہ پرستوں کی جانب سے کافی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایم.ایف. حسین کی تضادات کے ساتھ گہری نسبت رہی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ بہت سارے لوگ انھیں کی طرح بننا چاہتے تھے۔ منفرد انداز میں ان کی خاکہ نویسی، رنگوں کے تعلق سے ان کا شعور، ان کا پر سکون مزاج، متاثر کن شخصیت اور کام کے تئیں ان کی زندہ دلی کھیل ہی کھیل میں وہ کام کر جاتے تھے۔ ان کی چند تخلیقات استثنائی طرز کی ہیں۔ جہاں تخلیقات کے بارے میں صرف باتیں کی جاتی ہیں لیکن ایم.ایف. حسین تخلیق کار تھے۔ ان کے کام اور زندگی کی درجہ بندی نہیں کی جا سکتی۔ اگر وہ ننگے پیر چلتے تھے تو اس کے

Scanned by CamScanner

پیچھے بھی ایک اہم وجہ تھی۔ ان کا کہنا تھا چوں کہ انسانی جسم کی تمام نسوں کا آخری سرا، پیر کے نچلے حصے میں ہوتا ہے اس لیے ان کے عمل کو جاری رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ زمین سے ان کا رابطہ قایم رکھا جائے۔ اپنے منفرد طرزِ گفتگو کی وجہ سے وہ ہمیشہ تنازعات میں گھرے رہے۔ بین الاقوامی سطح پر ان کی مقبولیت ان کے حریفوں کو ہمیشہ کھٹکتی رہی لیکن وہ ہمیشہ پرسکون دکھائی دیے۔ ۱۹۷۰ء میں وہ دہلی کے آرٹسٹوں کے ایک متاثر کن نوجوان بن کر ابھرے۔ ان کے کام میں غلطیاں نکالنا اور تنقید کرنا اس وقت ایک فیشن بن گیا تھا۔ اگر ہم سوچیں تو یہ محسوس ہوتا ہے وہ لوگ جوان کی طرح بننے کے خواہش مند تھے اور نہیں بن سکے، اس طرح ان کے تئیں اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے تھے۔ اپنی بے چین طبیعت کی وجہ سے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ انوکھا کرتے تھے۔ اپنی فیاٹ ۱۱۰۰ کار کے دونوں دروازوں پر انھوں نے گھوڑے کی خوبصورت پینٹنگ بنائی تھی۔ گھوڑوں کی خوبصورت پینٹنگ میں رنگوں کے امتزاج اور خاکہ نگاری کو نظر انداز کر کے ان کے نقاد انہیں شومین کہتے تھے۔ تنقیدوں کی پروا نہ کرتے ہوئے ایم. ایف. حسین نے اپنا مصوری کا سفر جاری رکھا اور ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کے فنکار پنڈت بھیم سین جوشی کی اسٹیج پر گاتے ہوئے پینٹنگ بنائی۔ ایک دور وہ بھی تھا جب ایم. ایف. حسین فلمی پینٹر ہوا کرتے تھے۔ اس وقت چھ بائی دس فٹ کے پوسٹر بنانے کے انھیں صرف چار آنے ملتے تھے۔ اس پر بھی تنگ دستی کا حال یہ تھا کہ ایک بار معاشی حالات کی بہتری کے لیے انھیں ایک فیکٹری میں مزدوروں کی حیثیت سے کام کرنا پڑا۔ اس فیکٹری میں کھلونے تیار ہوتے تھے۔ اپنے انتقال سے صرف چار روز پہلے ہی ان کا ایک شاہ کار جس کا نام انھوں نے 'ہارس اینڈ وومن' رکھا تھا، لندن میں ایک کروڑ تئیس لاکھ روپے میں فروخت ہوا۔ ایم. ایف. حسین نے اپنی فنی زندگی کا سفر فلموں کے پوسٹر بنانے سے شروع کیا تھا مگر برسوں بعد ان کی بنائی ہوئی تصویریں خاص و عام میں اتنی مقبول ہوئیں کہ حسین کے فن پاروں کو اسٹیٹس سمبل سمجھا جانے لگا۔

ایم. ایف. حسین کی صلاحیتوں کو نہرو فیملی نے پرکھ لیا۔ جواہر لال نہرو نے انھیں پہلا بریک دیا۔ ایم. ایف. حسین نے ان کے کئی پورٹریٹ بنائے۔ ایم. ایف. حسین کی کامیابی کا سفر اتنا آسان نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کافی جدوجہد کی اور مشکلات کا سامنا کیا۔ مقبول فدا حسین ہندوستان میں مہاراشٹر کے چھوٹے سے قصبے پنڈھر پور میں ۱۷ر ستمبر ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے۔ عظیم مصور فدا حسین دنیا کی ان شخصیات میں سے ایک تھے جنھوں نے زندگی میں تو شہرت پائی ہی مرنے کے بعد بھی برسوں تک لوگ انہیں نہیں بھولتے۔ شہر میں ایک آرٹ اسکول چلانے والے وی. ڈی. دیولالیکر جو کہ اپنی کلاسیکل طرز کی پینٹنگ کے لیے مشہور ہیں، حسین کو مصوری کے تعلق سے کچھ ٹپس دیے۔ حسین ہیرو بننے کی تمنا لیے ممبئی شہر میں داخل ہوئے۔ معاشی تنگی کی وجہ سے فلموں کے پوسٹر بنانے میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے جے. جے. اسکول آف آرٹ، باممبے میں داخلہ لیا۔ لیکن گھر کی تمام ذمے داریاں ان پر تھیں اس لیے وہ یہ سلسلہ بھی زیادہ دنوں تک قایم نہیں رکھ پائے۔ دیگر ممبروں کے ساتھ مل کر انہوں نے 'پروگریسیو آرٹسٹ گروپ' کی بنیاد ڈالی۔ جس کے ممبروں میں ایم. این. سوز. ایس. ایچ. رضا، کے. ایچ. آر. اور اکبر پدمسی شامل تھے۔ ایم. ایف. حسین نے چار آنے سے ایک کروڑ تئیس لاکھ روپے کمانے تک کا سفر

Scanned by CamScanner

یوں ہی اور آسانی سے طے نہیں کرلیا بلکہ برسوں کی محنت اور اپنے کام سے لگن کی بہ دولت وہ اس مقام تک پہنچے۔ سچ پوچھیے تو ایک مصور کی حیثیت سے ان کی پہچان ۱۹۴۰ء میں ہوئی تھی جب کہ ان کی بنائی ہوئی تصاویر کی پہلی باقاعدہ نمائش ۱۹۴۷ء میں ہوئی تھی۔ پانچویں دہائی سے وہ ترقی پسند فنکاروں کی صف میں شامل ہوئے۔ ساٹھ کے عشرے سے انھیں ملک کا نہایت منجھا ہوا اور تجربے کار مصور شمار کیا جانے لگا۔ ان کی شہرت کو گویا پر لگے ہوئے تھے۔ جب یہ شہرت ملک کی سرحدوں سے نکل کر بیرون ملک پہنچی تو انھیں ہندوستان کا پکاسو کہہ کر پکارا جانے لگا۔ اسی اثنا میں راگ مالا سیریز کے لیے بنائی گئی ان کی ایک تصویر لندن کے کرسٹیز نیلام گھر میں لاکھوں ڈالرز میں فروخت ہوئی۔ انھوں نے بیرون ملک ہندوستان کی ثقافت، کلچر اور مذہبی روایات کو اپنے انداز میں متعارف کرایا۔ وہ ہندوستان کے ان چند عظیم مصوروں میں سے ایک تھے جن کے بنائے ہوئے شاہ کار کی بین الاقوامی مارکیٹ میں قیمتیں آسمان چھوتی ہیں۔ ۷۰ء کے عشرے میں ان کی شہرت نے ایک نیا موڑ لیا۔ بی۔ جے۔ پی۔ کے دورِ اختیار میں آنے کے بعد سے ان پر مشکلات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وہ یکا یک متنازعہ حیثیت اختیار کر گئے۔ انھوں نے کچھ ہندو دیوی دیوتاؤں کی عریاں تصاویر بنائیں جس کا جواز ان کے پاس یہ تھا کہ اجنتا اور ایلورہ کی تاریخی وادیوں میں بھی اسی طرح کے دیوتاؤں کے مجسمے ہیں لہٰذا اگر انھوں نے اپنے کینوس پر انھیں اتارا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ لیکن ان کا جواز کسی طرح قابلِ قبول نہ ہوا۔ سپریم کورٹ سمیت مختلف عدالتوں میں ان کے خلاف مقدمات قایم کر دیے گئے۔ انھیں قتل کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ بجرنگ دل نے ان کے خلاف مہم چلائی اور اُن کے سر کی قیمت پانچ ملین ڈالر مقرر کی جس کے بعد وہ ۲۰۰۶ء میں جلاوطنی پر مجبور ہوگئے۔ ستمبر ۲۰۰۷ء میں کیرالہ ہائی کورٹ نے فدا حسن کو ایوارڈ دینے پر پابندی عاید کردی۔ کیرالہ حکومت نے اُس سال مصوری کا معروف ''راجہ روی ایوارڈ'' فدا حسین کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

ستمبر ۲۰۰۸ء میں ہندوستان کی سپریم کورٹ نے مقبول فدا حسین کی ایک متنازعہ پینٹنگ کے سلسلے میں فنکار کے کام کا دفاع کرتے ہوئے اُسے فن کا نمونہ قرار دیا اور ان کے خلاف دائر درخواست خارج کردی گئی۔ عدالت کا کہنا تھا کہ ملک میں لاتعداد فحش تصویریں عام ہیں، ان سے لوگوں کے جذبات کیوں مجروح نہیں ہوتے؟ اس سلسلے میں دہلی ہائی کورٹ نے بھی ان کے خلاف دائر درخواست مسترد کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی پینٹنگ فحش نہیں۔

انھیں ملک کے اعلیٰ ترین اعزازات سے نوازا گیا جس میں پدم بھوشن بھی شامل ہے۔ انھیں پارلیمنٹ کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔ جس قدر ایوارڈز انھیں ملے، ان کا شمار بھی ایک مشکل امر ہے۔ مقبول فدا حسین فلمی دنیا کو اپنی طرف سے دبئی میں ہندی فلموں کا ایک نہایت وسیع میوزیم بطور تحفہ دینا چاہتے تھے جس کے لیے وہ آخری وقت تک کام بھی کرتے رہے گو کہ فوری طور پر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کام کس حد تک مکمل ہوا لیکن ان کے چاہنے والوں اور ان کے جانشینوں کو یہ کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ ان کا یہ خواب ضرور پورا ہو۔ وہ دنیا کے بے شمار ممالک میں ہندوستان کی پہچان بنے مگر انھیں آخری

Scanned by CamScanner

اعزازی شہریت دے رکھی تھی۔ بہ حیثیت مصور انھیں ہندوستان کا پکاسو کہا جاتا تھا۔ اپنے ستر سال سے بھی زیادہ کے کیریئر میں وہ پہلے گھوڑوں کی تصاویر بنانے کے لیے زیادہ مشہور ہوئے اور کچھ عرصہ پہلے لندن کے ایک نیلام گھر میں ان کی ایک پینٹنگ بیس لاکھ ڈالر میں فروخت ہوئی جو جنوبی ایشیائی مصور کے لیے ایک ریکارڈ تھا۔ ابتدائی زندگی کی جدوجہد کے بارے میں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ "چھے بائی دس فٹ کے پوسٹر کے لیے ہمیں صرف چار یا چھے آنے ملتے تھے اور بعض لوگ تو وہ بھی نہیں دیتے تھے۔ جیسے ہی میرے پاس کچھ پیسے جمع ہوتے، میں لینڈ سکیپ پینٹنگز بنانے کے لیے سورت، احمد آباد یا بڑودہ چلا جاتا۔" ۱۹۴۷ء میں اپنی پہلی نمائش کے بعد سے انھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پانچویں دہائی سے وہ ترقی پسند فنکاروں کے گروپ سے وابستہ رہے اور ماہرین کے مطابق ان کے کام میں جرمن پینٹر ایمل نولڈے اور آسٹریائی مصور کوکوشکا کے اندازِ مصوری کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہندی فلموں کی مشہور ادا کارہ مادھوری دکشت لمبے عرصے تک ان کے دل و دماغ پر چھائی رہی۔ مادھوری کے بے پناہ حسن کو انھوں نے اپنی پینٹنگز میں قید کیا اور ان کے ساتھ ایک فلم بھی بنائی جسے زیادہ کامیابی نہیں ملی، لیکن انھوں نے جو کچھ بھی کیا، اخباروں کی سرخیوں سے کبھی دور نہیں رہے۔ ۸۰ء کے عشرے میں کولکاتا کے ٹاٹا سینٹر میں انھوں نے کئی روز تک عوام کے سامنے چھے ہندو دیویوں کی پینٹنگ بنائی اور پھر آخری دن ان پر سفید رنگ پھیر کر انھیں تباہ کر دیا۔ وہ دھن کے بڑے پکے تھے۔ نڈر تھے، کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ ان کی آپ بیتی بھی شایع ہو چکی ہے۔ حسین کو جتنا ان کی مصوری کے لیے یاد کیا جائے گا اتنا ہی ان کی منفرد شخصیت کے لیے بھی یاد کیا جائے گا۔

❁❁❁

طالبِ علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ کلاس روم میں ہی ادب نہ پڑھے بلکہ کلاس روم کے باہر بھی ادب پڑھے، ادب جیے اور ادب میں ڈوبا رہے۔ وارث علوی

انصاری انعام الحق

مادھوری دکشت

ایم ایف حسین کی موت......

میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے

حسین صاحب اپنے پیچھے کئی یادیں چھوڑ گئے ہیں۔ان کی اہم ترین بات زندگی کے تئیں ان کا عشق تھا۔ان کا باطن ایک بچے کی طرح بے داغ تھا۔وہ مجھ سے بالکل بچے کے انداز میں کہا کرتے تھے:''واہ!تم میری پسندیدہ ادا کارہ ہو۔''ان کی موت میری زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ہے۔ایک بہت بڑے مصور ہونے کے علاوہ ایک بہترین انسان بھی تھے جوان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ان کے ساتھ میری کئی یادیں وابستہ ہیں۔وہ مجھےفون کرتے تو یہ ضرور پوچھتے کہ''کیا حال ہے مادر وطن کا؟''

آرن(میرا پہلا بیٹا)کی پیدائش کے موقع پرانھوں نے مجھے مدر انڈیا کے نام سے مخاطب کیا۔میں ان کے ساتھ برابر رابطے میں رہا کرتی تھی مگر گزشتہ دو برسوں سے ہم صرف دو یا تین مہینوں میں ایک بار گفتگو کر پاتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا زیادہ تر وقت سفر ہی میں گزر رہا تھا۔وہ جب بھی مجھے فون کرتے تو مجھے پوچھتے:''تم کہاں ہو؟''''............میں یہاں ہوں۔''جس کے جواب میں کہتے کہ''یہ وہ جگہ تو نہیں ہے،جہاں میں ہوں۔''آپ ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں،کبھی لندن،کبھی قطر اور کبھی کسی مقام پر۔ان کی شخصیت کیا زبردست تھی،حالاں کہ ان کی عمر۹۵رسال کی تھی مگر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنے عمر رسیدہ ہیں۔ان کی زندگی کے بے شمار مقاصد تھے۔انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ ایک مزاحیہ فلم بنانا چاہتے ہیں۔میں اکثر سوچتی ہوں کہ اگر میں ۹۵رسال کی عمر کو پہنچی تو کیا اس وقت مجھ میں اتنی توانائی ہوگی؟وہ حقیقی معنوں میں ایک تخلیقی انسان تھے۔میں نے انھیں کبھی زندگی سے شکوہ شکایت کرتے ہوئے نہیں سنا۔وہ اپنا تمام تر وقت اپنی تخلیقی سوچ پر صرف کیا کرتے تھے اور اس پر غور کیا کرتے تھے کہ ان کی اگلی تخلیق کیا ہوگی۔اسی چیز کی بدولت وہ بلا کسی روک ٹوک

Scanned by CamScanner

کے آگے بڑھتے چلے گئے اور انھیں مزید توانائی بھی حاصل ہوتی گئی۔ بے شک وہ اپنی مثال آپ تھے۔ ان کے جیسا بننا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے۔ وہ ایک مشعل کی طرح روشن رہے اور اسی تاب ناکی کے ساتھ انھوں نے اپنا آخری سفر بھی کیا۔ میرے بیٹے کے ذہن میں ان کی یادیں روزِ روشن کی طرح بسی ہوئی ہیں۔ خود میرے ذہن میں ان کی بے شمار یادیں بسی ہوئی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس عظیم انسان سے ہونے والی ملاقاتوں کا احاطہ کس طرح کر پاؤں گی۔ انھوں نے تقریباً ایک صدی کی زندگی گزاری ہے۔ انھوں نے دنیا بھی بہت زیادہ دیکھی ہے۔ انھوں نے بے حساب سفر کیا ہے اور اس دنیا سے بہت زیادہ حاصل بھی کیا ہے۔ انھیں اگر کوئی غم کھائے جاتا تھا تو وہ یہ تھا کہ وہ اپنے ملک واپس نہیں آ سکتے تھے۔ ایک دو مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ انھیں ہندوستان کے سبھی تہوار بہت یاد آتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ''ہندوستان ایک خوبصورت ملک ہے اور افسوس کہ میں اسے دیکھ نہیں پاؤں گا۔'' میرا خیال ہے کہ اُن کے دل کے گوشے میں اپنے گھر واپسی کی ٹیس ہمیشہ تازہ رہتی تھی۔ اُن کا تعلق پنڈھر پور سے تھا اور وہ وہاں جانا چاہتے تھے۔ بس یہی اُن کی زندگی کا غم تھا ورنہ انھوں نے مکمل حیات ایک تخلیقی انسان کی حیثیت سے گزاری ہے اور زندگی سے کبھی شکوہ نہیں کیا۔

***

ادب کی مثبت اور آفاقی قدروں کا ترجمان

سہ ماہی

اثبات

چار شماروں کا زرِ سالانہ: 400 روپے

رابطہ

Esbat (Urdu Quarterly)

B/202, Jalaram Darshan,

Pooja Nagar, Mira Road-(E) Dist:Thane.401107

Scanned by CamScanner

جہانِ کتب

کتاب کا نام: حرف حرف معتبر (نگارشاتِ صفوت علی کا تجزیہ)

مرتبہ: ڈاکٹر سید یحیٰی نشیط

صفحات: 180

قیمت: 250 روپے

ملنے کا پتا: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکٹ، دریا گنج، دہلی۔

مبصر: **محمد رفیع انصاری**

'حرف حرف معتبر' (نگارشاتِ صفوت علی کا تجزیہ) ڈاکٹر یحیٰی نشیط کی مرتب کردہ کتاب ہے۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اردو میں مہجری ادب کے تعارف و تفہیم کا پہلا مگر انوکھا تجربہ ہے۔ مرتب نے اسے بڑے اعتماد و یقین کے ساتھ اہلِ ذوق کے لیے پیش کیا ہے۔ پیش لفظ میں اس امر پر حیرت ظاہر کی گئی ہے کہ اردو مہاجر شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کو مہجری ادب کے تناظر میں کبھی نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی الگ زاویے سے ان پر تنقیدی نظر ڈالی گئی۔ اردو کی مستقل آبادیوں میں بیٹھے اردو والوں نے ان پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ بلکہ مختلف قیاس آرائیاں کر کے ان کے حوصلوں کو پست کیا۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو اردو کی تازہ اور نئی بستیوں کے اہلِ قلم کی آب و تاب کچھ اور ہوتی اور اردو دنیا ان کے تخلیقی کارناموں سے باخبر رہ کر اردو زبان کی مقبولیت اور شہرت پر ناز کرتی۔ اس تبصرے کے بعد اُن اہلِ قلم، رسالوں و جریدوں کے ذمہ داران اور مدیران کا ذکر ہے جنھوں 'مہجری ادب' کے متعلق گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

اس بیش بہا کتاب میں ڈاکٹر یحیٰی نشیط کا ۳۷ صفحات پر مشتمل مضمون ''مہجری ادب اور صفوت'' دراصل ایک تحقیقی مقالہ ہے جس میں ڈاکٹر موصوف نے ادبیاتِ عالم میں مہجری ادب کی قدر افزائی اور اردو والوں میں اس کی ناقدری پر افسوس کے اظہار کے ساتھ ساتھ ہماری بدقسمتی پر آنسو بھی بہائے ہیں...... نیز اردو معاشرے کی بے حسی کا ماتم بھی کیا ہے۔ اپنے اس مدلل اور مفصل مضمون میں انھوں نے نئی بستیوں کے ادب کو سنجیدگی سے پیش کرنے والے جیالوں کو نام بہ نام خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ طول طویل مگر سود مند گفتگو کے بعد مہاجر شاعر 'صفوت علی' کی شاعرانہ عظمت اور ادیبانہ بصیرت پر سیر حاصل کلام کیا ہے...... جس کی ایک ایک بیش قیمت سطر پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ ابھی اردو والوں کو اپنے اہلِ قلم سے

Scanned by CamScanner

مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے......ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں ہے۔

صفوت علی صفوتؔ کی شخصیت بڑی دل آویز ہے۔وہ ہمارے لیے سات سمندر پار کا بیش قیمت تحفہ ہیں۔کہنے کو صفوتؔ علی اردو کے شاعر اور ادیب ہیں لیکن درحقیقت وہ آنے والی صدی کے مزاج داں، مسلمان سائنس داں، حساب داں، ماہرِ علمِ طبیعات، استادِ کیمیا ہونے کے ساتھ کمپیوٹر کے ماہر ہیں۔امریکہ کی شمالی مشرقی ریاست 'کنے ٹی کٹ' میں رہتے ہیں اور شہر نیو یارک کی مشہور ٹیلی فون کمپنی بل اٹلانٹک کے شعبۂ مواصلات میں کمپیوٹر کے ماہر کی حیثیت سے ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہیں۔صفوتؔ گزشتہ چالیس برسوں سے امریکہ میں مقیم ہیں، اردو اور انگریزی میں لکھنے کا کام عبادت سمجھ کر کر رہے ہیں۔وہ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ان کی شاعری میں 'سلام' بھی ہے اور 'پیغام' بھی۔اس سلام و پیام سے قاری اپنے اندر ایک خوش گوار تبدیلی محسوس کرتا ہے۔اسے ایسا لگتا ہے کہ ان کا ہر شعر اور نثر کا ہر ایک جملہ اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر رہا ہے۔صفوتؔ صاحب کے فن پارے اردو ادب میں ایک اضافہ ہیں۔

صفوت علی صفوتؔ کی تخلیقات میں تین مثنویاں 'مثنویِ وقت' مثنویِ رسول، مثنویِ نیوران' کے علاوہ ایک شعری مجموعہ 'سوادِ حور' شامل ہے۔نثر میں ان کے پندرہ مضامین کا مجموعہ 'فکر فردا' ہے علاوہ ازیں انگریزی ادب میں ان کا کام جانا پہچانا ہے۔اس باب میں آپ نے بیحد مفید اور تحقیقی سائنسی مضامین تحریر کیے ہیں۔مستقبل قریب میں ان کی چونکانے والی کتاب MARS منظرِ عام پر آ رہی ہے۔

اس باکمال اور باادب شخصیت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ دینِ حنیف اور مذاہب عالم کے مطالعے سے علم اور فکر و ادراک کے ذریعے اپنے افکار و اعمال کا دامن وسیع تر کرنا چاہتے ہیں۔بقول پروفیسر مامون ایمن ''وہ ثقافتی اور مذہبی آداب کی قدر کرنا چاہتا ہے۔اسے جسم کی آسائش مطلوب ہے اور روح کی آسودگی بھی، وہ ہمہ تن پُرسکون ہونے کے باوجود ہمہ تن مضطرب بھی ہے۔سکون اور اضطراب کا یہ غیر معمولی امتزاج ان کی زبان میں بھی کارفرما ہے اور بیان میں بھی۔''

صفوتؔ کا نثری و شعری سرمایہ 'گراں مایہ' ہے۔کتاب میں تکرار کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ جنابِ صفوتؔ نے 'مثنویِ وقت' مثنوی رسولؐ اور مثنویِ نیوران' لکھ کر اردو میں مثنوی کے فن کی بازیافت کی ہے اور اس کے لیے نئی بحر کا انتخاب کیا ہے جس میں تا حال کوئی مثنوی نہیں لکھی گئی ہے۔ ان کی سب سے مشہور مثنوی 'مثنویِ وقت' کا سن تصنیف ۱۹۹۹ء ہے۔یہ وقت کی کہانی ہے۔اس میں وقت کی ابتدا سے لے کر اس کی انتہا تک تمام احوال کا بیان ہے۔وقت ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور اس کی پیچیدگی کو حل کرنے کی کوششیں ہمیشہ ہوتی رہی ہیں۔شاعر نے وقت کا ایک واضح تصور پیش کیا ہے۔

کتابِ مذکور میں صفوتؔ کی شخصیت کا جائزہ انتہائی ایمان داری سے لیا گیا ہے۔بعد ازاں اکابرین نے صفوتؔ کے فن پر سیر حاصل گفتگو بھی کی ہے اور نتائج بھی اخذ کیے ہیں۔غلام مرتضیٰ راہیؔ ،صفوتؔ کے شعری مجموعے' سوادِ حور' کے متعلق

Scanned by CamScanner

کہتے ہیں'' سوادِحور' کا شاعر ایک منفرد اور بلاشرکتِ غیرے شخصیت کا حامل ہے۔اس کے شعری اظہار میں ایک طرح کا ترچھا پن ہے۔زبان و بیان کا ایک ایسا انصرام ہے جو رمز و ایما، ابہام اور ایہام کے تانے بانے سے مرتب ہوا ہے جو قاری کو اسرارِ معانی کی پرتوں کو کھولنے کی ترغیب دلاتا ہے۔' سوادِحور' نے مجھے شاعری کے ایک بالکل نئے اور انوکھے ذائقے سے آشنا کیا ہے۔'' عشرت ظفر کے خیال میں 'صفوت کی تمام تر شاعری وقت کی غیر مختتم شاہ راہ کا ایک روشن اور تاب ناک سنگِ میل ہے۔'سید ضمیر جعفری کے بقول 'صفوت اپنے کھودے کنویں کا پانی پینے والا لحن ور ہے۔' ڈاکٹر فاروق شکیل، ڈاکٹر مشتاق صدف اور سیتی سرونجی اس بات پر متفق ہیں کہ 'سوادِحور' کا جو بھی مطالعہ کرے گا وہ صفوت علی سے بیحد قریب ہو جائے گا۔'

صفوت کے کلامِ بلاغت نظام کے نمونے 'ہیرے موتیوں' کی مانند کتاب ہٰذا میں جا بہ جا جگمگا رہے ہیں۔ان کی شاعرانہ خوبیوں کے بیان میں تواتر کے ساتھ جو اشعار رقم ہوئے ہیں اُن میں سے چند یہ ہیں ؎

پھیر دینا مرا منہ کعبے کو امریکہ سے — بولے صفوت جو کہا آخری خواہش کیا ہے

لو سانس بھی آہستہ کہ ٹوٹے نہ مرا خواب — سرکارِ دو عالم مرے پاس آنے لگے ہیں

تخلیق ہم ہوئے ہیں عبادات کے لیے — ایندھن نہیں ہیں جنگِ سماوات کے لیے

کتاب میں ۲۲ رمضامین ہیں جن میں تین مرتب جناب یحییٰ نشیط کے، تین پروفیسر مامون ایمن کے، دو ف.س. اعجاز کے اور بقیہ دوسرے اہلِ قلم کے۔کتاب میں صفوت علی صفوت کا ایک انٹرویو (جسے 'چہار سو' راولپنڈی کے مدیر گلزار جاوید نے لیا ہے) 'براہِ راست' کے عنوان سے شامل ہے۔جسے پڑھنے کے بعد صفوت کی شخصیت اور ان کے کار ہائے نمایاں کا پتہ چلتا ہے۔یہ براہِ راست گفتگو قاری کے علم و فہم میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔انٹرویو کے چند جملوں سے صفوت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

نیو یارک کے ادبی منظر نامه پر میری آمد۱۹۹۲ء سے ھے۔

میری شاعری ، میرا فلسفه،میری نثر،ان سب کا تعلق مستقبل سے ھے۔

کائنات کے مطالعے کا سلسله میرے بچپن سے جاری ھے۔

سائنس ، مذھب اور شاعری ایك دوسرے سے جدا نھیں کیے جاسکتے۔

امریکه میں دو سال ذھنی مریضوں کے ساتھ کام کرنے کے بعد میں نے مثنویِ نیوران' لکھی ھے ۔میری نظر میں یه انگریزی اور اردو میں پھلی جامع کوشش ھے۔

اگر کسی سائنس داں نے قرآنِ مجید کو غور سے پڑھا اور سمجھا ھے تو

Scanned by CamScanner

اس کے لیے مذہب اور سائنس میں فرق نہیں،یہ تو ربطِ خفی کی شناخت کا مسئلہ ہے:

میرے تجربات کے تحت اردو ادب زوال پذیر نہیں۔

یہ کتاب جہاں اردو میں ہجری ادب کے متعلق پہلے باب کی حیثیت رکھتی ہے وہیں یہ 'صفوؔت شناسی' کے ضمن میں بھی ایک اہم کتاب ہے۔جس کے لیے مرتب مبارک باد کے مستحق ہیں۔کتاب کے سرورق کی پیشانی پر لکھا ہے'ہجری ادب کے تعارف اور تفہیم میں اولین تجربہ'۔

کتاب کا انتساب بھی متاثر کن ہے'دنیا کے تمام مہاجرین ادبا،شعرا کے نام جنھوں نے دیارِ غیر میں اردو سے لَو لگائے رکھی ہے'

امید ہے یہ کتاب دنیا کے مہاجرین ادبا و شعرا کو اردو والوں سے قریب اور جناب صفوؔت کو قریب تر کرنے کا بہترین وسیلہ ثابت ہوگی۔

❀❀❀

کالج کے امتحانات اور گرمی کی تعطیلات کے باعث گوشۂ طالبات کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی۔

(ادارہ)

Scanned by CamScanner

مکتوبات

● شمس الرحمٰن فاروقی..الہ آباد

'ادبی کارواں' کا نیا شمارہ ملا۔شکریہ۔یہ شمارہ پچھلے سے بہتر ہے۔گزشتہ شمارے پر میں نے اپنی تفصیلی رائے بھیجی تھی، خدا معلوم ملی کہ نہیں۔موجودہ شمارہ اس سے خالی ہے۔

آپ کا اداریہ خوب ہے لیکن آپ کی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ میرا پنے' گلستانِ اشعار' میں اس قدر محور ہتے تھے کہ انھیں اپنے پائیں باغ کی خبر نہ تھی۔یہ روایت کسی قدیم تذکرے میں نہیں ہے۔اس کے پہلے راوی محمد حسین آزاد ہیں۔اس کے درست ہونے کا کوئی ثبوت نہیں۔دوسری بات یہ کہ اگر یہ روایت صحیح بھی ہے تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ یہ ''مجہول اور مریضانہ کیفیت'' ہے؟ اگر یہ مریضانہ کیفیت ہے تو بزرگوں کا اپنا گھر بار چھوڑ کر حقیقت یا حق کی تلاش میں نکل جانا یا فقیری لے لینا یا بن باس لے لینا بھی مریضانہ اور مجہول کیفیت کا اظہار کہلائے گا اور سب سے پہلے مجہول اور مریضانہ کیفیت والے شخص غالباً گوتم بدھ قرار پائیں گے جنھوں نے حق کی تلاش میں حکومت، محل، بیوی، بچہ، دولت سب کچھ چھوڑ دیا اور بے سروسامان نکل پڑے۔

فضیل جعفری پر آپ کا مضمون اچھا ہے لیکن خود فضیل صاحب کا مضمون میرؔ پر مجھے محلِ نظر لگا تھا۔میں نے گزشتہ شمارے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ بات تفصیل سے لکھی تھی۔

(ہمیں بے حد افسوس ہے کہ ہم فاروقی صاحب کے بہت اہم خط سے محروم رہے۔)

● علی احمد فاطمی..الہ آباد

ادبی کارواں کا تازہ شمارہ ملا......اداریہ پڑھ کر جی خوش ہوگیا۔تقریباً انھیں مسایل پر ایک مختصر سا مضمون میں نے بھی لکھا ہے لیکن آپ کا اداریہ پڑھنے سے قبل میں نے اسے 'تحریرِ نو' میں بھیج دیا ورنہ میں آپ کو ہی بھیجتا۔مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ جن مسایل پر میں نے سوچا اسی طرز پر آپ نے بھی سوچا اور غالباً ہر سنجیدہ اہلِ ادب، ادب کی بقا اور ارتقا کو لے کر فکر مند ہے۔ادب میں جس نوع کی بے ادبی کی فضا بن گئی ہے یا بنا دی گئی ہے جس میں بڑے بڑے ذمے دار ادیب و ناقد بھی شامل ہیں، ان کے خلاف سچے اور ایمان دار اور نئے لوگوں کو اب کھل کر سامنے آنے کی ضرورت ہے۔ایسے میں رسایل کا رول بے حد اہم ہو جاتا ہے۔

● عبدالصمد..پٹنہ (بہار)

آپ کی محبت ہے کہ آپ اس دور دراز کو یاد کر لیتے ہیں۔'ادبی کارواں' مجھے بہت پسند آیا۔مجھے اندازہ ہے کہ وسایل نہیں

Scanned by CamScanner

رہتے ہوئے بھی آپ ایک معیاری رسالہ نکالنے پر کمربستہ ہیں۔ ہندوستان کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں Little Magzine کی اہمیت بھی ہے، مقبولیت بھی۔ میں تو ضخیم رسالہ نکالنے والے دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ اس کے ساتھ ایک رحل بھی بھیج دیں۔ آج کے کمپیوٹر دور میں کسے بہت پڑھنے کی فرصت ہے۔ اس رسالے کو تمام لوگوں تک پہنچنا چاہیے۔ میں جلد ہی آپ کے لیے کچھ کروں گا۔ انشاءاللہ! ایک بار پھر مبارک باد قبول کریجیے۔

● **شکیل گوالیاری**.............................گوالیار

سہ ماہی 'ادبی کارواں' کا شمارہ (۲) موصول ہوا۔ شکریہ...... گنتی کے چند رسالوں میں ایک شایستہ، خوش گوار اور معنی خیز رسالے کے اجرا پر میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیں۔ سائز بھی مناسب ہے۔ رسالے کو توڑ مروڑ کر قاری تک پہنچانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مضامین، افسانے، تبصرے مختصر ہوتے ہوئے بھی کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ فضیل جعفری صاحب کی کتاب 'افسوس حاصل کا' کے حوالے سے آپ نے کیا کیا شعر کوٹ کیے ہیں۔ لیکن سچ بتاؤں آخری شعر نے کیا قصور کیا تھا کہ آپ کی طبیعت بدمزہ ہوگئی۔ میرے تو رونگٹے کھڑے کر دیے اس شعر کے دوسرے مصرعے نے ؏

تو اتنے جانور کس طرح بستر سے نکل آئے

● **رؤف خیر**.............................حیدرآباد

تازہ شمارہ (۲) ملا...... احمد مشتاق کی غزل کے شمس الرحمٰن فاروقی تو خیر ہیں ہی مشتاق و مبلغ، معلوم ہوا اسلوب احمد انصاری بھی ان کے قایل ہیں۔ قایل تو ہم بھی ہیں۔ اچھا مضمون آپ نے شایع فرمایا ہے۔ فضیل جعفری کے شعری مجموعے 'افسوس حاصل کا' پر آپ کا تبصرہ متوازن ہے۔ بلراج ساہنی پر انیس امروہوی کا مضمون بھی اچھا لگا۔ اقبال اور ندا فاضلی کا کیا جوڑ؟ بھلے ہی ماں کے حوالے سے سہی۔ فیض پر ان دنوں کئی خاص نمبر اور گوشے نکل رہے ہیں۔ آپ نے صرف ایک مختصر سے مضمون سے فیض کو نمٹا دیا۔ کوئی اچھا مضمون شایع فرمایئے گا۔

● **احتشام اختر**.............................کوٹہ (راجستھان)

ادبی کارواں ملا۔ شکر گزار ہوں۔ آپ کا اداریہ توجہ طلب اور فکر انگیز ہے۔ آپ نے گلوبلائزیشن کی بات کی ہے، ماحولیاتی آلودگی کی بات کی ہے اور ادب اور تنقید پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ مجھے اداریے کا عنوان بھی بہت پسند آیا۔ احمد مشتاق کا شعر بہت خوب ہے۔ احمد مشتاق پر اسلوب احمد انصاری کا مضمون بہت اہم اور فکر انگیز ہے۔ اگرچہ مضمون پرانا ہے لیکن بامعنی اور Relevent ہے۔ انصاری صاحب کا اندازِ نقد بالکل منفرد ہے۔ احمد مشتاق ہندوستان میں تب مشہور ہوگئے تھے جب شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں فراق سے بہتر شاعر کہا تھا۔ دیگر مضامین میں غالب کی مشکل پسندی (قاضی جمال حسین) اور فضیل جعفری 'افسوس حاصل کا' کے حوالے سے (امیر حمزہ ثاقب) قابلِ مطالعہ ہیں۔ غالب کی مشکل پسندی کا اکثر ذکر ہوتا ہے لیکن غالب کے ہاں بہت آسان شعر بھی مل جاتے ہیں اور سہلِ ممتنع کے اشعار بھی ملتے ہیں ؎ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے   آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس شعر کی تو نثر بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ تو اپنے آپ میں خود نثر ہے۔ گوشۂ طالبات اور جہانِ کتب بھی پسند آیا۔ ۹۶ر صفحات میں آپ نے بہت سارا معیاری مواد پیش کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسالے کی عمر دراز کرے (آمین)

Scanned by CamScanner

● **خالد عبادی**......................پٹنہ

'ادبی کارواں' باصرہ نواز ہوا۔ آپ کا اداریہ بہت سنجیدہ اور فکر انگیز ہے۔ آپ نے اپنی بات بہت سلیقے اور شائستگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ادب کے تعلق سے زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بشیر بدر کا شعر ہے ؎

پتھر کے جگر والو غم میں وہ روانی ہے   خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

جو بات اس شعر میں غم کے حوالے سے کہی گئی ہے وہی بعینہٖ ادب کے حوالے سے بھی کہی جا سکتی ہے۔ مضامین ایک پر ایک ہیں۔ مجھے اسلوب احمد انصاری کا مضمون (احمد مشتاق کی غزل) خاص طور سے پسند آیا۔ مشرف عالم ذوقی اور نیر جا مادھو کی کہانیاں اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرتی ہیں۔ ذوقی کے یہاں مسلسل لکھتے رہنے کے باوجود کچھ نیا کر گزرنے کا جذبہ ماند نہیں پڑتا۔ اس کہانی (اکیلے آدمی کی موت) میں بھی مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا۔ ظفر گورکھپوری، رونق شہری، عبدالرحیم نشتر اور احتشام اختر کی غزلیں خوب ہیں۔ راشد جمال فاروقی کی دوسری غزل (یہ واقعہ تو لگے ہے سنا ہوا سا کچھ) نے بھی متاثر کیا۔ میری طرف سے ایک صاف ستھرے اور باوقار رسالے کی اشاعت پر مبارک باد قبول فرمائیے۔

● **مجیر احمد آزاد**......................دربھنگہ

ادبی کارواں کا تازہ شمارہ ملا۔ شکریہ۔ آپ کا اداریہ عصری تقاضے سے ابھرتا ہوا ایک سودمند سوال اور بحث کے آغاز کا اشاریہ ہے۔ آپ نے معاشرتی پہلو کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ادب کی معنویت، جمالیاتی حس، تجرید، منطقیت اور مقصدیت سے گفتگو کی ہے۔ آپ کا اداریہ غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔ اس شمارے میں 'گوشۂ طالبات' تھوڑا توجہ طلب ہے۔ البتہ انصاری نائمہ عبدالعزیز کا مضمون 'کرشن چندر' معلوماتی اور محنت سے لکھا گیا ہے۔ اس کی خوبی اختصار میں جامعیت ہے۔ خان زاہدہ کا مضمون 'اقبال، ندا فاضلی اور وارث علوی' بہت اہم مضمون ہے۔ وارث علوی کے خیالات کو خان زاہدہ نے بڑے سلیقے سے اپنے جذبات اور تجربے کی روشنی میں پرکھا ہے، قلم کار کو اتنا ایمان دار ضرور ہونا چاہیے۔ فیض احمد فیض کی شخصیت (انصاری نغمہ شمس الدین، قاضی سعدیہ) فیض کی شخصیت کے چند گوشے ہی روشن کر سکا۔ میرا ماننا ہے کہ طالبات کو اپنے مضامین میں حوالہ جات کا استعمال کرنا چاہیے اور جہاں سے مواد حاصل کیا گیا ہے اس کا ذکر ہونا چاہیے۔ مجموعی طور پر آپ کی رہنمائی میں ویمنز کالج کی طالبات کی صلاحیتیں نکھر رہی ہیں۔ کسی بھی تعلیمی ادارے کے لیے یہ نیک شگون ہے۔

یہ شمارہ مضامین، افسانے اور متفرقات کی عمدہ پیش کاری کے سبب دل کش ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا افسانہ 'اکیلے آدمی کی موت' نے شروع تا آخر اپنے سحر میں رکھا ہے۔ یہ افسانہ فکر اور فن ہر دو اعتبار سے بہتر ہے بلکہ یہ کہوں تو غلط نہیں ہے کہ نک سک سے درست وتوانا ہے۔ م. ناگ کا بائیں پسلی پسند آیا۔ محمد طارق کی کہانی کے درون میں یگانگی اور بھائی چارگی کا قند گھلا ہوا ہے جس کی مٹھاس ہر کسی کو پسند ہے، مجھے بھی...... اس لیے انھیں بھی مبارک باد...... ہندی کہانیاں ان دنوں اردو کے الفاظ سے اس طرح رچی بسی رہتی ہیں کہ سوائے رسم الخط کے فرق کو چھوڑ کر بہت امتیاز کرنا آسان نہیں ہوتا۔ آپ نے 'اکیلے چنے کی آزادی' اردو میں پڑھنے کا موقع مہیا کیا، اچھا لگا۔ قاضی جمال حسین نے 'غالب کی مشکل پسندی' کو احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔ بھیم سین جوشی کی یادیں اور بلراج ساہنی کے حالات وکوائف آپ کی دور بینی اور ادب کے ساتھ تہذیب وثقافت سے گہری دل چسپی کے مظہر ہیں۔

دعا گو ہوں کہ 'ادبی کارواں' کا سفر آب وتاب سے جاری رہے۔

Scanned by CamScanner

ممبئی یونیورسٹی کی جانب سے جی۔ایم۔مومن ویمنز کالج کو "بیسٹ کالج ایوارڈ" ملنے پر کوکن مسلم ایجوکیشن کے صدر واراکین پرنسپل اور جملہ اسٹاف کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

شعبۂ اُردو، جی۔ایم۔مومن ویمنز کالج، رئیس ہائی اسکول کیمپس
تھانہ روڈ بھیونڈی ضلع تھانہ۔ 421302

Scanned by CamScanner